قل من حرم زینه الله التی اخرج لعباده

انہیں بتا دو — اللہ نے اپنی مخلوق کی زینت و زیبائش (اور میک اپ) کا سامان کیا ہے'

اسے حرام کہنے والے کون ہوتے ہیں؟ (مفہوم اعراف' 31)

لباس اور چہرہ کیسا ہونا چاہیئے؟

تحریر: رحمت اللہ طارق

شکل و شباہت اور لباس کے بارے میں دنیا میں پہلی سنجیدہ کوشش

جس سے ظواہر پرست متشددوں کے آئینہ اخلاق میں پڑنے والے

نادیدنی بال کا معائنہ آسان ہو چلا ہے اور پھر حدیث

من تشبه بقوم فهو منهم

کی فنی تحلیل کے بعد بہت سوں نے اعتراف بھی کیا ہے کہ

داڑھی یا کسی خاص وضع قطع کا لباس "مسلمان" ہونے

کے لئے شرط کی حیثیت نہیں رکھتے

ریسرچ و تحقیق کا حسین مرقع

ادارہ ادبیات اسلامیہ' ملتان

بسم الله الرحمن الرحیم

انتساب

مُحَمّد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ و سلم کے نام

○ جن کی آمد کا مقصد قرآن نے اپنے مہکدار الفاظ میں یہ بتلایا ہے کہ — مذہبی احکام کی بے جا سختیاں' مذہبی زندگی کی ناقابل عمل پابندیاں' غیر فطری عقیدوں اور عقیدتوں کا بوجھ' عالموں اور فقیہوں کی تقلید کی بیڑیاں اور پیشواؤں کے تعبد کی زنجیریں توڑ کر انسانوں کو حریت و مساوات کی زندگی سے آشنا کرنا ہے۔ (اعراف 156)

○ جنھوں نے فرمایا کہ **بعثت میسرا ولا بعثت معسرا** — میں کائنات بشری کو سہل اور آسان راہ (جس کی عقل بھی تائید کرتی ہو) دکھلانے اور دشواریوں و مشکلات کے تاریک پردوں کو تار تار کرنے آیا ہوں۔

○ جنھوں نے مذہبی تشدد اور نفرت کی راہوں پر چلنے والوں کے سامنے آکر ان کا رخ محبت' پیار اور انسانیت کی شاہراہوں کی طرف موڑ دیا۔

○ جنھوں نے بیکسوں' ناداروں اور کمزوروں کو سہارا دے کر شاہنشاہوں اور کج کلاہوں کی ہمسری عطا کی۔

○ جنھوں نے تقدس' برتری اور نفرت کے بت پاش پاش کر کے نوع بشری کی اونچ نیچ کو مساوات اور یکسانیت کا روپ عطا کیا۔

○ جنھوں نے انسانوں کو بالوں اور مخصوص شکلوں کی پیچیدگیوں سے نکال کر نجات کے حقیقی سبب سے آشنا کیا اور فرمایا **قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا** — توحید کی راہ چلو' خطرات سے بچے رہو۔

○ جنھوں نے اشارہ دیا کہ مذہبی دہشت گردی اور وضعی نظریات کو تسلیم کرانے کے لئے تشدد پذیری کی اسلام میں گنجائش نہیں ہے **لا اکراہ فی الدین** (بقرہ 256)

○ جنھوں نے تاثر دیا کہ متعصب انسان کا جوہر قابل ناکارہ ہو جاتا اور بہت سی خوبیوں اور کردار کی اعلیٰ قدروں کے ادراک سے محروم ہو جاتا ہے۔ **صلی اللہ علیہ و سلم**۔

اس تحریر کا پس منظر

جن حالات و واقعات کی وجہ سے یا ان کی موجودگی میں کوئی چیز ظہور میں آئے' اسے پس منظر کہا جاتا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ 1956م کے اواخر میں' نہ مہینہ یاد ہے نہ موسم کیوں کہ ان دنوں دسمبر میں بھی اہلِ مکہ پنکھے چلا لیتے تھے لہٰذا موسم کا تعین بھی نہیں کر سکتا۔ میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ حرم کے شمال میں جہاں مصلی حنفی کی عمارت تھی (اب تفریق کے تمام نشانات مٹا دیے گئے ہیں) نماز مغرب کے بعد میں بیٹھا تھا اور میرے متوازی ایک ادھیڑ عمر کا نوجوان مصری بھی تشریف فرما تھا کہ اتنے میں ایک "بدو" ٹائپ کا عربی جو چہرے مہرے سے بنیاد پرست معلوم ہوتا تھا' آیا اور آتے ہی تحکمانہ لہجہ میں مصری پر برس پڑا کہ تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟— جواب ملا کہ عمرہ کرنے— یہ سن کر بنیاد پرست کا پارہ چڑھ گیا اور اس نے چھوٹتے ہی کہا کہ— اس منہ اور اس شکل کے ساتھ؟ جواب ملا کہ مجھے کیا ہے؟ میں وجیہ ہوں' میں شکیل ہوں' توحید و رسالت پر ایمان رکھتا ہوں— مگر تمہارا ایمان' ایمان نہیں ہے۔ تمہارے چہرے پر داڑھی نہیں ہے۔اس نے بڑے تحمل سے جواب دیاں کہ میرے بھائی! پورے قرآن پاک میں ساری داڑھی رکھنے تو خیر' ایک بال رکھنے کا حکم بھی نہیں ہے۔ آپ کس بنیاد پر مجھے ایمان سے خارج کر رہے ہیں؟ اس پر ظاہر پرست نے کہا کہ

من تشبه بقوم فهو منهم

کی رو سے تم نصرانی ہو' تم یہودی ہو— اس پر سخت جان مصری نے کہا کہ اس

وقت حرم میں طواف کنندگان اور بیٹھے ہوئے قرآن پڑھنے اور ذکرو اذکار کا ورد کرنے والوں میں سے 95% بے ریش ہیں جو آپ کے فتوے کے بموجب نصرانی اور یہودی ہیں. انہیں حرم میں داخل کیوں ہونے دیا گیا؟ اس طرح ان کے مابین لہجے کی تلخی میں الفاظ کا جو تبادلہ ہوا وہ روح فرسا ضرور تھا مگر میرے شوق جستجو کیلئے مہمیز ثابت ہوا اور میں اسی ٹوہ میں لگ گیا کہ حدیث **"من تشبہ"** کی بنیاد اور اصلیت معلوم کرلوں کہ سرسید علیہ الرحمہ کی نصیحت تھی کہ گفتگو جب حدیث کے حوالے سے ہو تو بلاوجہ تردید سے بچنا چاہئے اور حدیث کی اصلیت اور بنیاد معلوم کرنے پر زور دینا چاہئے. چنانچہ میں نے سید کی نصیحت کو "پلے" باندھا اور حدیث ہذا کی تشریح کی بابت خاصا مواد جمع کرڈالا اور جب یہ مضمون تیار ہو گیا تو ہفت روزہ "نصرت" لاہور کو بھجوا دیا—— مضمون چھپ گیا جس سے ذہنوں میں ارتعاش پیدا ہو گیا. دوستوں نے مرحبا کہا اور ظاہر پرستوں نے صلواتیں سنائیں—— ان دنوں دہشت گردی کا رواج اگرچہ عام نہیں تھا تاہم جن چہروں پر شکنیں پڑ گئیں' وہ اپنے پر قابو نہ پا سکے اور مکتبہ جدید کے مالک چودھری رشید احمد کے خلاف نالش کر دی. عدالت نے انصاف کے ترازو میں رکھ کر فیصلہ دیا کہ رسالہ میں مولویوں کا تحریر کردہ جواب شائع ہو—— مگر جواب تو آج تک نہ مل سکا. یہ تھا پس منظر تحریر ہذا کا.

طارق

25 جون 2000 ملتان

قوموں کو اپنی زبان' تہذیب' قومیت' لباس اور شکل و شباہت سے بے حد پیار ہوتا ہے۔ ادھر اللہ نے بھی اپنی کتاب محکم میں قومیتوں اور زبانوں کی تخلیق کو اپنا شاہکار کہا ہے بشرطیکہ اس سے "تکریم" کی اعلیٰ قدریں مجروح نہ ہوں—— لیکن سلفیوں کے امام ہمارے ابن تیمیہ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد عربی زبان' عربی قومیت' عرب عادات اور عرب کلچر حتیٰ کہ شکل و شباہت کو غیر عربی زبان' قومیت اور تہذیب پر "برتری" دلانا تھا وغیرہ—— راقم نے مکہ مکرمہ میں بیٹھ کر اس نظریہ کی نفی کی اور ابن تیمیہ کے نظریہ قومیت و زبان کو "پوچ" و ناتواں ثابت کیا اور ثابت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم عالم بشریت کے غیر متنازع ہادی و راہنما اور اسلام' نوع انسان کیلئے غیر جانبدارانہ ضابطہ حیات ہے۔ وہ قومیتوں اور زبانوں کے امتیاز کو قائم رکھ کر بھی جانبدار اور فریق نہیں بن سکتے۔ لیکن افسوس کہ اتنی واضح اور انسانی نفسیات کے عین مطابق پالیسی کو تشدد پسندوں نے پسند نہیں فرمایا اور لاہور کی ایک عدالت میں نالش کر دی۔ ادھر عدالت نے مقالہ ہذا کو انصاف کے ترازو میں رکھ کر درست قرار دیا اور ظاہر پرستوں سے کہا کہ اسلام کی روح اور سپرٹ کو ملحوظ رکھتے ہوئے—— ناشر کو اس تحریر کا جواب فراہم کیا جائے اور وہ اسے پورے اہتمام سے شائع کر دیں لیکن پھر ایسا ہوا کہ جواب کے انتظار میں پورے چالیس سال ہونے کو ہیں۔ ایک نسل مرکھپ گئی مگر جواب دہی کے لئے کسی ہونٹ نے جنبش نہیں کی—— اب اس کہنہ مقالہ کا تقاضہ ہے کہ اسے مکرر منصۂ شہود پر لایا جائے تاکہ قومیتوں اور زبانوں کی نفی کرنے والے اور قومیتوں' زبانوں اور مشتبہ شکلوں پر "اِترانے" والے اپنے اپنے نقطہ نظر کا جائزہ لے سکیں—— طارق

تاریخ نے نظریات و شخصیات کے ساتھ ہمیشہ یہ بے انصافی روا رکھی ہے کہ مصنوعی اور وضعی خیالات و عقائد کی رنگ آمیزیوں سے اصل حقیقت کو عوام الناس کی نظروں سے چھپا دیا ہے—— قرن اول کے بعد اسلام کی مذہبی تاریخ میں جس فکری اور عملی انتشار کا سراغ ملتا ہے' اس کے پس منظر میں بہت سے ایسے ہاتھ کار فرما تھے جن کی واضح طور پر نشاندہی نہیں کی جا سکی—— اس حقیقت سے انکار نہیں کہ نو مسلم عربوں میں ایک طبقہ ایسا بھی موجود تھا جو دین کے "ظواہر" پر زور دینے اور بے عملوں پر تشدد و اجبار کا قائل تھا۔ کیوں کہ ان کے نزدیک ظاہری عمل دل اور باطن کا آئینہ تصور ہوتا تھا۔ چنانچہ آگے چل کر ان کے اس تحت الشعوری خیال نے واضح اور شعوری حیثیت اختیار کر لی اور یہ قرار پایا کہ روح اور سپرٹ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو—— اسلام نام ہے ظاہری ہیئت و شکل کا—— ظاہری ہیت و شکل لباس سے متعلق ہو خواہ چہرے کی وضع و قطع سے' اس میں خالص عربی کلچر کا اتباع نہ کرنا حرام اور بسا اوقات کفر کے مترادف ٹھہرایا گیا۔ تاریخ نے اس طبقہ کو صدر اول ہی میں "خارجی" کے امتیازی وصف سے پکارا تھا اور یقین تھا کہ عامۃ المسلمین ان کے دیگر بہت سے متشددانہ نظریات کی طرح اس غیر اسلامی نظریہ کی تکذیب بھی کر دیں گے لیکن ہوا یہ کہ مرور زمانہ کے بعد ہمارے سنجیدہ اکابر خود ہی اس چکر میں پھنس گئے اور اب انھیں بھی دھوکا ہونے لگا کہ ہو نہ ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہی تو ہو سکتا تھا کہ آپ عرب کو سربلند کریں اور غیر عربی تمدن اور کلچر کو دنیا سے مٹا کر خالص عربی کلچر کو باقی رہنے دیں۔ جب یہ عقیدہ رسوخ میں پوری شدت اور پختگی میں تصلب اختیار کر گیا تو اب اس سے بحث کرنا لاحاصل ہو سکتا تھا۔ لیکن ایک جویائے حق کے لئے تصویر کا اصلی رخ اتنا غبار آلود اور غازۂ

اکاذیب و مفتریات کی دبیز تہوں میں اتنا پوشیدہ ہو چکا تھا کہ اس کے اندر اسلام کے حقیقی نقوش اور صحیح خدوخال کا پتہ لگانا بے حد دشوار ہو چلا تھا۔ اس لئے ضرورت تھی کہ ان غباروں اور غازوں کو پوری جرأت سے جھاڑ دیا جائے تاکہ اسلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی مشن کا اصلی رخ واضح اور نمایاں ہو سکے۔ اس سلسلہ میں فکر و نظر کی جن سنگلاخ وادیوں میں آبلہ پائی کرنا پڑی' ان سے حاصل شدہ صدمات زخم پا ــــ اور شدت درد کا اندازہ مطالعہ مضمون کے بعد قارئین حضرات کا احساس ہی بہتر کر سکتا ہے۔

بعثت نبوی ﷺ کا ایک مقصد:

دیگر انبیاء سے قطع نظر قرآن نے بعثت نبوی ﷺ کا ایک مقصد یہ بھی قرار دیا ہے کہ

"وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ"

(اعراف' 156) ــــ مفہوم:

یہ کہ مذہبی اجارہ داروں نے عام انسانی آبادی پر جو مذہبی بوجھ ڈال رکھے اور خود عائد کردہ پابندیوں کے طوق و سلاسل' زینت گردن بنا رکھے تھے یہ **نبی الرحمۃ**' اپنے مقدس ہاتھوں سے انھیں اتار پھینکنے کی غرض سے بھیجا گیا ہے اور اب اس کا پہلا کام انسانوں کی کراہتی ہوئی آبادی کو اسلام جیسے دین فطرت کی نعمت سے سرفراز فرما کر ہمیشہ کے لئے ان بوجھل طوق و سلاسل کو توڑ ڈالنا اور ریزہ ریزہ کرنا ہے۔

خود ایجاد "ظواہر" پر تشدد اور چھوٹے چھوٹے امور کو بڑھا چڑھا کر پھر اس بہانے "سخت گیری" کی خوفناک پالیسی کو اعلیٰ اقدار حیات کے منافی قرار دے کر یکسر ختم کر دینے کا جو حکم قرآن حکیم نے دے دیا تھا وہ فطرت انسانی کے عین مطابق اور وجدان رسالت کا اولین "منشاء" تھا

افراط و تفریط کا مہلک وائرس :

فرمایا — **لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ** (نساء' 170۔ مائدہ' 77)

دین میں "غلو" کی سمیت شامل کر کے ذہنوں میں بگاڑ پیدا مت کرو۔

غلو کے معنی ہیں تشدد اور سخت گیری کا ایسا مظاہرہ کرنا جو خود دین کی حدود سے نکال دے۔ جبکہ نبی الرحمتؐ کو ایسی تاریک ذہنیت اور تنگ ظرفی کیوں کر گوارا ہو سکتی تھی۔ آپ جانتے تھے کہ غلو کی عادی قومیں صحیح راہ عمل نہیں پا سکتیں اور جلد ہی دین سے انکار کر بیٹھتی ہیں۔

دین میں جبر و اکراہ کی پالیسی : فرمایا — **لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ** (بقرہ' 256)

دین میں تنگ ظرفی اور تشدد ہوتا ہی نہیں جبکہ ہدایت اور گمراہی کی راہیں الگ الگ ہیں — کیونکہ تشدد و اکراہ اور جبر سے ذہنوں پر جو نقشہ "مرتسم" ہو گا اس کی ہر "لکیر" انتقام اور بغاوت کے رنگ سے نمایاں ہو گی۔ یہ ایک عام تنبیہہ ہے — یہاں غیر مسلموں پر تو جبر و اکراہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' خود حلقہ بگوشان اسلام کو بھی ایسی "بد تمیزی" گوارا نہیں ہو سکتی کیوں کہ انسان فطرتاً آزاد' حریت پسند اور یسر دوست واقع ہوا ہے جبراً ٹھونسے ہوئے نظریات اس کے ذہن میں راسخ نہیں ہو سکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سخت گیر پالیسی سے دامن بچاتے ہوئے اپنے اور اپنے مشن سے متعلق صاف اور غیر مبہم الفاظ میں فرمایا

ان اللّٰہ تعالی لم یبعثنی معنتا ولا متعنتا ولکن بعثنی معلما میسرا۔

یعنی اللہ تعالی نے مجھے سخت گیر اور متشدد بنا کر نہیں بھیجا۔ لہجہ کی تپش سے پاک لہجہ میں تعلیم دینے والا اور دین میں تمام مشکلات کو دور کرنے والا (**میسر**) بنا کر بھیجا ہے۔ (عائشہؓ — مسلم)

یہ تو تھا آپ ﷺ کی پالیسی اور مشن کا غیر مبہم اور واضح اعلان۔ لیکن آپ ﷺ نے اپنے رفقاء' جانشینوں اور سفراء کو جو تعلیم فرمائی اس کا نقشہ بھی کچھ

اس قسم کا تھا کہ — **یسروا ولا تعسروا**

نرمی اور یسر سے پیش آؤ۔ سختی اور عسر سے نہیں۔ خندہ پیشانی اور بشاش چہرہ سے کام لو'
نفرت اور بیزاری سے نہیں (ابوداؤد — اپنے سفیروں کو وصیت)

یہ تھا خلاصہ تعلیم نبوی اور تعلیمات قرآن کا — اس کے برعکس جب ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ہی کی طرف منسوب تعلیمات کا ایک ایسا رخ بھی ہمارے سامنے رکھا جاتا ہے جس کی روشنی میں آپ ﷺ جیسے خلق عظیم کے مالک دنیا پر عربی تمدن اور عربی کلچر مسلط کرنے کے لئے ایک سخت گیر حاکم اور جابر قسم کے مذہبی راہنما کا روپ لئے ہوئے' چھوٹی چھوٹی باتوں پر جہنم یا کم از کم گردن زدنی کے سزاوار قرار دیتے نظر آتے ہیں۔ جبکہ آپ کی ذات بابرکت کے لئے قران نے رؤف اور رحیم کا خطاب تجویز فرما کر (توبہ' 129) آپ کی ذات کے متعلق پوری صفائی بیان کرتے ہوئے سخت گیری کے تصور کو غلط ٹھہرایا ہے۔

غیر عربی لباس اور چہرہ:

یہ بات کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی خاص لباس یا کسی وضع قطع کو اسلام اور کفر میں حد فاصل قرار دیا تھا' اس سلسلہ میں ہمارے علماء کی مساعی یہی ہیں اور انہوں نے اپنا فرض اسی کو گردانا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اس خیال کی توثیق کی جائے۔ لیکن راقم الحروف نے دیگر کروڑوں جاں نثاران محمدؐ کی طرح اس خیال کے بارے میں عدم اطمینان کا اظہار کیا تو اساتذہ اور بزرگوں نے یہ کہہ کر چپ کرا دیا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا فرمان ہے —

من تشبه بقوم فهو منهم

جس نے جس قوم سے مشابہت پیدا کرلی وہ ان میں سے ہو گیا۔ (احمد' ابوداؤد اور طبرانی)

بلکہ اس سے بھی زیادہ وضاحت سے فرمایا کہ:

من تشبه بغيرنا فهو ليس منا

جس نے غیروں کی وضع قطع اختیار کرلی وہ مسلمان ہو کر بھی ہم سے کٹ گیا۔" — (ترمذی)

یعنی توحید و رسالت پر ایمان لانے کے باوصف دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا کیوں کہ وہ اس حقیقت کا منکر ہو گیا کہ لباس اور چہرہ کی مخصوص ملکوتیت اور اسلام ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم یعنی وہ بات جو منسوب الی الرسول ﷺ ہو' اس کا ماننا مسلمانوں کے لئے حاصل ایمان اور نہ ماننا سراسر موجب خسران ہے۔ لیکن ایک ایسی حدیث جس سے اسلامی دنیا کا 98 فیصد طبقہ متاثر ہوتا ہو اور مسلمان ہونے کے باوصف نہ اسلام نے اسے تحفظ دیا اور نہ صدق دل سے ایمان نے —— جو کہ آپ ﷺ کی صحیح تعلیمات کی روح یا سپرٹ سے بالکل میل نہ کھاتی ہو۔ آپ ﷺ کی طرف اس کی نسبت کا یقین تو کیا شکوک و شبہات کے ایسے دروازے کھول دیتی ہے' جو کبھی بند نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا چاہیے تو یہ تھا کہ اس حدیث کے بارے میں جس کی نظریاتی حیثیت اسلام کے فکری نظام کو نہ صرف تہ و بالا اور کمزور کرتی ہے بلکہ ایک مدت سے اسلام کی تعبیر میں تضاد اور کش مکش کا باعث بھی بنی ہوئی ہے' خالص علمی تحقیق سے کام لیا جاتا اور ضروری نہیں کہ منفی انداز میں بلکہ اس کے نصب العینی مقام کا خالص فنی حیثیت سے جائزہ لیا جاتا اور ان عناصر کا کھوج لگایا جاتا جو اس حدیث کی تشکیل اور وضع کا سبب بنے۔ لیکن اس کے برعکس ہوا یہ کہ اس طبع زاد منسوب الی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم حدیث کو اسلام کے تفسیری اور تعبیری نظام میں ایک مستقل شق کی صورت دے دی گئی۔ ملکوتی صورت کے ذوق کے ماروں نے نہ جانے کتنے خالص مسلمانوں کو خود ایجاد وضع و قطع کا پابند نہ پا کر اسلام اور امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے نکال دیا ہو گا اور نہ جانے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر اہل ایمان پر لعنتیں بھیجنے میں کتنی ٹھوکریں کھائی ہوں گی اور یہ محض اس لئے کہ اتباع شریعت کے ساتھ ساتھ داڑھی اور کسی خاص لباس کو لازم و ملزوم قرار دیا گیا ہے۔

امت کو چھانٹ ڈالا کافر بنا بنا کے
اسلام ہے تیمیہ ممنوں بہت تمہارا

وضع قطع کا نظریہ:

وضع قطع کے نظریئے کا انحصار جن روایات پر ہے ان سب کے راوی یا ان سے استناد کرنے والے کس قماش' کس ماحول اور کن نفسیات سے متاثر تھے؟ آج کی صحبت میں یہ اور اس قسم کے دیگر سوالات کے تفصیل وار جوابات عرض کئے جائیں گے ــــ وہ بڑے بڑے بت اور صنم جو کہ اماموں اور شیخ الاسلاموں کا روپ دھارے خدائی کر رہے تھے' ان کی نقاب کشائی کر کے اصلی اور حقیقی روپ میں پیش کئے جائیں گے۔ اس سے مقصود چند حقائق کا برملا اظہار ہے۔ خدانخواستہ عامۃ المسلین کو "ملکوتی" چہروں سے بد ظن کرنا یا ان سے توجہ ہٹانا نہیں ہے ــــ اس ضمن میں منتشر طور پر ہمارے علمائے کرام نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن اس موضوع پر اپنے خیالات کو جامع صورت میں (یکجا کر کے) جس طرح امام ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ (1328م) نے پیش کیا ہے۔ اس نے گویا ــــ نیابتاً تمام علماء کے موقف کو واضح صورت دے دی ہے۔

یوں تو امام موصوف کے علمی مقام سے کس کو انکار ہے لیکن مذکورہ تحقیق میں امام صاحب نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے اور اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے جو طرز استدلال منتخب فرمایا ہے۔ اس سے وہ کسی بھی حق کی جستجو رکھنے والے کا اطمینان نہیں کرا سکے۔ امام موصوف نے ایک کتاب ــــ **اقتضاء الصراط المستقیم فی مخالفۃ اصحاب الجحیم**' لکھی تھی جسے غالباً- پہلی مرتبہ مرحوم نواب صدیق حسن خان' (1889م) نے اپنی بے نظیر کتاب "**الدین الخالص**" کے حاشیہ پر طبع کرایا تھا ــــ اب یہ عجیب حادثہ ہے کہ دین خالص کے تناظر میں تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم گورے کو کالے پر اور عربی کو عجمی پر نہ ترجیح دیں نہ برتری عطا فرمائیں مگر سید صدیق

الحسن ایک ایسی کتاب کو اپنا ردیف بنائیں جس میں سارا زور اس پر صرف کیا گیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کی بعثت کا مقصد ہی عربی زبان' عرب قومیت اور عربی کلچر کو دنیا پر مسلط کرنا تھا— حالانکہ اللہ نے ہر زبان کو اپنا شاہکار' ہر قوم اور قبیلہ کو اپنی منشا سے شناسائی بخشی ہے۔ ایسے میں "برتری" کا فارمولا پیش کرنے سے قرآن کا صریح انکار لازم آتا ہے—

ہاں تو اسی کتاب کو بعد میں محمد امین الخانجی نے **المکتبہ الخانجی** " مصر سے 1907م میں شائع فرما کر دنیا کو اس نادرہ روزگار سے روشناس کرایا— اس کتاب کا موضوع یہ ہے کہ "**من تشبہ**" کی رو سے تمام وہ لوگ جہنمی ہیں جن کی تفصیل اس کتاب میں دی گئی ہے۔ امام موصوف نے اس ضمن میں بعض ایسی کمزور' ضعیف اور پوچ بلکہ بے ہودہ احادیث سے بھی استدلال فرمایا ہے جن کے متعلق خود انھیں بھی اعتراض ہے کہ ناقابل استدلال ہیں۔ مثلاً وہ ایک حدیث کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس کے راوی— "**ابی العمیاء**" — کا پتا نہ چل سکا کہ وہ کون ہے۔ لیکن یہ بجائے خود کیا کم دلیل ہے کہ ابو داؤد نے بے چون و چرا اسے نقل کیا ہے۔

(اقتضاء۔ طبع مصر' صفحہ 44' سطر 22)

لیکن اپنے پوچ نصب العین کی پشت پناہی کی خاطر آپ اپنی جلالت شان کا لحاظ نہ کرتے ہوئے ہر اس حدیث کی توثیق ہی فرماتے چلے گئے جس کا میزان تنقید میں کوئی وزن ہی نہ ہو سکتا تھا اور بالآخر یہ قرار دیا ہے کہ "عربی وضع و قطع کی پابندی کرانا ہی شارح کا مقصود اولین اور بعثت محمدیہ صلی اللہ علیہ و سلم کا منشاء و مطلوب تھا۔

(صفحہ 27 سطر 3 و 12— صفحہ 28 سطر 19 و 24— صفحہ 29 سطر 6— صفحہ 32 سطر 17— صفحہ 41 سطر 8— صفحہ 43 سطر 1— صفحہ 67 سطر 23' 24 وغیرہ وغیرہ)

اتنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ یہاں تک فرما گئے کہ حدیث "**من تشبہ**" کے

ظاہر مفہوم سے یہ غیر عربوں سے مشابہت کرنے والے کا کفر ہی ثابت ہوتا ہے اور اگر کفر نہ بھی کہو تب بھی وہ "حرام" کا مرتکب ضرور ہے۔ (صفحہ 29 سطر 23 و 24) غور فرمایئے' اس حرمت و تکفیر کا فیصلہ کسی نص قرآنی یا کسی غیر مبہم اور صحیح حدیث کی بناء پر نہیں کیا جا رہا بلکہ ایک ایسی حدیث کی رو سے امت مسلمہ کی تقدیر کا فیصلہ ہو رہا ہے جس کی خالی صحت بھی مشکوک ہے۔ تفصیل تو اپنے مقام پر آئے گی۔ خود امام ابن تیمیہ (رح) نے بھی اس حدیث کو صحیح نہیں کہا بالکہ **هذا اسناد جيد** (ص 39) اور یہ کہہ کر اپنی کمزوری کا پتہ دے دیا کہ یہ حدیث زیادہ سے زیادہ اس ہی سند کے ساتھ **جید** ہے۔ یعنی اصطلاح محدثین میں اسے اگرچہ پوری طرح صحیح نہیں کہا جا سکتا تاہم چلو ٹھیک ہی ہے کہا جا سکتا ہے۔

حلت و حرمت کا معیار

امام صاحب اس مقام پر اپنے مشن کو تقویت پہنچانے کے لئے ایک بے ہودہ— ظنی و منکر (بے بنیاد) حدیث پر حلال و حرام اور کفر و اسلام کی عمارت کھڑی کر رہے ہیں جبکہ دوسرے مقام پر خود ہی ہمیں یہ درس دیتے ہیں کہ

ان السلف لم يطلقوا الحرام الا ما علم تحريمه قطعا

سلف صالحین جس چیز کی حرمت قرآن حکیم کے قطعی حکم سے ثابت نہ ہو' اس پر حرام کا اطلاق نہیں کرتے تھے۔

(**كتاب الاداب الشريعة** طبع مصر جلد 125/1 نیز **تفسير المنار**' طبع سوم مصر' جلد 433/10)

اور میرے خیال میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے نظریۂ تحریم سے سلف صالحین کا مسلک زیادہ مضبوط اور عصری تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ کیوں کہ حضرت امام

شافعی (820 م) بھی یہی فرماتے تھے کہ — **ادرکت مشائخنا من اھل العلم یکرھون فی الفتیا ان یقولوا ھذا حلال و ھذا حرام الاما کان فی کتاب اللہ مبینا بلا تفسیر**

"ہمارے صاحبان علم اساتذہ فتویٰ دیتے وقت حلال و حرام کا لفظ استعمال کرنا مکروہ (ناپسندیدہ) جانتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جس چیز کو واضح طور پر قرآن میں بغیر تفسیر کے حلال یا حرام کہا گیا ہو اسے ہی حلال یا حرام کہنا چاہیے — (کتاب الام (Alumm) تصنیف امام شافعی طبع مصر جلد 3/319)

اسی طرح کتاب الام میں امام نخعی (815 م) کے حوالے سے نیز ثابت کیا ہے کہ وہ بھی نص قطعی کے بغیر — دلیل ظنی (خاص طور پر اس جیسی حدیث، طارق) سے حرمت و حلت کا فتویٰ دینا جائز ہی نہیں سمجھتے تھے۔

ان توضیحات کے بعد اب آپ ان جنمی لوگوں سے ملئے جو حدیث "**من تشبہ**" کی ہمہ گرفت کے باعث دھر لئے گئے۔ **وباللہ التوفیق**۔

حدیث "**من تشبہ**" کی ہمہ گیر حیثیت ۔

(1) امام صاحب فرماتے ہیں کہ یہ حدیث زیادہ تر لباس سے متعلق ہے کیوں کہ حقیقی **تشبہ** لباس ہی سے معلوم ہو سکتا ہے۔ احمد بن حنبل (855 م) قاضی ابو یعلی حنبلی، ابن عقیل اور شیخ عبدالقادر جیلانی (1166م) و دیگر فقہائے حنابلہ کہتے تھے کہ — لباس کی تمام وہ قسمیں جو کہ غیر عربی شائل کے مطابق سلی ہوں۔ خاص کر ایرانی کٹ کے مطابق ہوں تو ان کا پہننا حرام ہے۔" (صفحہ 66 سطر 3 تا 4،) اسی طرح پیروان امام ابو حنیفہ کا نیز فتویٰ ہے کہ — غیر عربی لباس پہننے والا قطعی کافر ہے (صفحہ 65) — جبکہ غیر عربی میں کفار اور مسلمان یکساں داخل ہیں (صفحہ 67 — تفصیل آ رہی ہے۔)

(2) بال ترشواتے وقت گدی کا سنوارنا یعنی بوڈی بنانا، (خواہ مولوی کٹ بال بنواتے وقت گدی کے بال مونڈھنا) — امام احمد کے نزدیک حرام ہے۔

(صفحہ 28 و صفحہ 65) اسی طرح ابراہیم، ہشیم بن حمید، اور معمر بن سلیمان کا فیصلہ بھی یہی ہے۔ (ص 29) کیوں کہ یہ مجوسیوں کا فیشن ہے۔

(3) کفار کے تہواروں میں کوئی حلال جانور (مثلاً بطخ وغیرہ ذبح کرنا، خنزیر کے ذبح کرنے کے برابر ہے (فقہائے مالکیہ و فقہائے شافیہ صفحہ 85)

(مہمان آئے تو اسے دال چاٹنے پر مجبور کریں، مرغی ذبح نہ کریں — ط)

(4) جہاں آواز نہ پہنچتی ہو وہاں سر اور ہاتھ یا انگلیوں کے اشارے سے سلام کا جواب دینا یہود اور نصاریٰ سے "تشبہ" کی وجہ سے حرام ہے۔ (صفحہ 40)

غالباً سب کے سب مسلمان، یہودی یا نصاریٰ ہی بن چکے ہیں جبکہ حدیث میں ہے جب کوئی نمازی پر سلام کرے تو نمازی اشارے سے جواب دے۔ طارق)

(5) سندھی ساخت کی جوتی امام احمد اور سعید بن عامر کے نزدیک عورت خواہ مرد کے عام استعمال کے لئے یکساں حرام ہے کیوں کہ سندھی عجم الاعاجم یعنی ایرانیوں کی نسبت زیادہ غیر عربی ہیں۔ ہاں اگر اس جوتی کی اہانت مقصود ہو ——— یعنی ——— غلاظت کے مقام پر استعمال کرنا مقصود ہو تو اس حد تک اجازت ہے (صفحہ 40)

سندھی ساخت کی جوتی کی طرح کرمانی (ایرانی) کھسہ پہننا بھی ابن مبارک اور حرب کے نزدیک حرام ہے۔ یہی لوگ کہتے ہیں کہ سبتی یعنی سندھی جوتا پہننا سعید بن عامر ضی کے نزدیک حرام ہے (صفحہ 40) کیونکہ اسے کاہن ——— یعنی سنٹرل انڈیا کے کافر پہنتے ہیں (حالانکہ بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سبتی جوتا استعمال کیا ہے۔ طارق)

(6) فارسی مہینے مثلاً ——— دتے ——— آذر، لکھنا فارسی نام مثلاً فیروز، پرویز، اور اورنگ زیب رکھنا قطعی مکروہ (حرام سے قریب تر) ہیں۔ (صفحہ 65) ——— امام احمد، امام مجاہد، عبداللہ بن مبارک اور اسحاق بھی ایسا ہی کہتے تھے (صفحہ 96)۔

(7) فارسی زبان کا سیکھنا، لکھنا پڑھنا اور بامر مجبوری بولنا ——— **من تشبہ**

—— کی رو سے حرام ہے (عمرؓ بن الخطاب و علیؓ بن ابی طالب صفحہ 93) —— امام السلفی دو سندوں سے عبداللہ بن عمر کا قول نقل کرتے ہیں کہ فارسی زبان "منافق" بناتی ہے۔ (صفحہ 97، 98)

تبصرہ: لیکن قرآن مجید میں جن جغادری منافقوں کا ذکر ہے وہ خالص عربی جاننے والے تھے۔ تو کیا عربی زبان بھی منافق بناتی ہے۔ نیز ارشاد ہے —— **ومن آیاتہ.... اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ** —— یہ زبانوں کا اختلاف اور بو قلمونی ہمارے —— عظیم شاہکاروں میں سے ہے (روم، 22) تو کیا اللہ سبحانہ بالواسطہ منافق گر تھے؟ کیا فارسی زبان اللہ نے پیدا نہیں کی؟ کاش زبانوں سے اتنا تعصب اور نفرت روا نہ رکھے جاتے۔ اردو والوں نے بنگالی زبان سے نفرت کی اور پاکستان بننے کے آٹھ ماہ بعد بنگلہ کے خلاف زور کی تحریک چلائی، بندے مارے گئے، جلائے گئے اور پھر اسی "برتری" کے عمل نے پاکستان کو جو روز بد دکھلایا، وہ ہر ایک پر عیاں ہے اور تعجب ہے کہ ہمارے پاکستانی آج بھی "بنگلہ دیش" پر اردو کی برتری کے قائل ہیں جبکہ بنگالی خود بھی مسلم اکثریتی زبان —— ہے۔ تدریسی زبان ہے، عدالتی زبان ہے۔ اسی طرح اردو اقلیت جب سندھ میں داخل ہوئی تو یہاں بھی اردو برتری کے خسیس جذبے نے انہیں سندھی پر وار کرنے کے لئے ابھارا جس سے نفرت پھیلی، فرقہ واریت نے برملا زور پکڑا اور پھر فوج اور اردو والوں نے مل کر سندھی کو محدود کر دیا۔ تمام ریلوے سٹیشنوں کے نام اردو رسم الخط میں لکھے گئے جبکہ ان کا صوتی لہجہ سندھی کی مخصوص "ہجا" سے تعلق رکھتا تھا۔ سندھی جو کہ ذریعہ معاش و روزگار تھی، بیک جنبش قلم درسگاہوں سے محو کر دی گئی جبکہ سندھی صدیوں سے تدریسی زبان تھی، ترجمہ کی زبان تھی، بہی کھاتے کی زبان تھی، کچہری کی زبان تھی، مذہبی قدیم لٹریچر کی زبان تھی۔ مخصوص تہذیب، ثقافت، شناخت اور تمدن کی ترجمان زبان تھی۔ اس کے حروف ہجا، مستقل پہچان رکھتے اور ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں سے زیادہ تعداد میں تھے اس میں

حروف مرکب صرف گھ اور جھ تک محدود تھے۔ کاش اس قدیمی' تہذیبی اور اسلامی "اثر" کو "محو" نہ کر دیا جاتا۔ آج زبان ہی کی اساس پر صوبہ دو لسانی علاقہ —— بنا دیا گیا ہے۔ کیا اس سے خیر سگالی اور قربت کے جذبات فروغ پا سکیں گے؟ اس کا جواب تقریباً نفی میں ہے اور نفی ہی میں رہے گا۔ سچ ہے انسان کو اپنی زبان اور قومیت سے جو پیار ہے' وہ فطری پیار ہے اور پیار کسی مصنوعی ذرائع سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔

(8) غیر مسلموں کے ملک میں کسی نمائش (مہرجان) میں سٹال کھولنے' رہائش اختیار کر کے وہاں مرنے والا روز قیامت مشرکوں میں اٹھایا جائے گا
(عمرو بن العاص صفحہ 93)

تبصرہ: آج بلاد یورپ' آسٹریلیا' امریکا و دیگر ممالک میں لاکھوں مسلمان رہائش پذیر ہیں۔ اپنی مصنوعات کے سٹال بھی لگاتے اور وہاں اعلیٰ ملازمتیں اور کاروبار بھی کرتے ہیں جو سب ابن تیمیہ کے نزدیک قیامت کے روز مشرکوں میں شمار ہوں گے۔ خاص کر مرنے والوں کا ٹھکانا ہر حال میں جہنم ہی ہو گا کیوں کہ انہیں جب موت پر قابو تھا تو وہاں کیوں مرے؟ کیوں نہ اپنے گھر لوٹ کر موت کو لبیک کہا۔ کیوں نہ ایسا ہوا کہ وہ کربلا' کاظمین یا مکہ —— مدینہ پہنچ کر عزرائیل کی خدمات سے مستفید ہوئے؟

(9) حضرت حزیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ ایک صحابی کی تقریب ولیمہ میں شمول کے لئے بلائے گئے تو وہاں عجمی ساخت کا فرنیچر اور سامان دیکھ کر شامل نہیں ہوئے۔ واک آؤٹ کرتے ہوئے فرمایا "**من تشبہ بقوم فھو منھم**" (صفحہ 63/6 تا 7)

(10) لڑائی میں ایرانی ساخت کے آلات حرب مثلاً تیر و کمان وغیرہ استعمال کرنے بالکل جائز نہیں (صفحہ 66 و 67)

تبصرہ: قرآن میں **اعدوالھم ما استطعتم من قوۃ** کے مطابق آلات حرب جہاں سے میسر کر کے اپنی حربی قوت میں اضافے کرنے کا حکم عام ہے آج اگر برطانیہ' روس' امریکہ سے بھاری معاوضے دے کر حربی سامان حاصل کیا جا

سکتا ہے تو کل کو عجمیوں سے وقت کے مطابق منجنیق اور خود حاصل کرنا کیوں حرام تھا؟ کیا اسلام کا مثبت پہلو صرف منفی بنیادوں پر استوار ہے؟

(11) نمازی اور قبلہ کے مابین چٹان حائل ہو تو وہاں نماز پڑھنی حرام ہے کیوں کہ حجر پرستی میں کفار سے مشابہت ہو جاتی ہے۔ (صفحہ 61)

تبصرہ: ان ترشے ہوئے پتھر کو تو یہ مشرک بھی نہیں پوجتے خاص کر کعبہ اقدس کوئی اینٹ چونے سے تعمیر نہیں ہوا۔ وہاں جیسے بھی بے ڈول' چورس' تکون اور گول پتھر میسر آئے' کسی طرح کے گارے سے چن دیئے گئے ــــ اور کسی کے تصور میں بھی یہ بات نہ آئی کہ یہی پتھر پوجنے کے لئے ہے؟ کیا شرک کے لئے ضروری ہے کہ صرف پتھر ہی سامنے رکھے جائیں دل اور عقیدے سے جو شرک ثقافتی صورت اختیار کر چکا ہے اس سے کچھ نہیں ہو گا؟

(12) فارسی زبان میں حج اور عمرہ کا احرام باندھنا (یعنی نیت کرنا' دعا مانگنا' حلف اٹھانا ــــ) امام مالکؒ اور عمرؓ بن الخطاب کے نزدیک ممنوع ہے۔ (صفحہ 64) ــــ عبداللہ بن مبارک کے نزدیک "سوگند بہ یزدان" کہنا حرام ہے (صفحہ 97)

تبصرہ: زبانیں اللہ نے پیدا کی ہیں بلکہ تخلیق "السنہ" کو اپنی آیات سے موسوم کیا ہے اور "آیات" کے معنے شاہکار کے ہیں تو اللہ کا شاہکار بھی یہی ہے کہ اس میں نہ دعا قبول ہوتی ہے نہ حج اور احرام کی نیت باندھی جاتی اور حلف اٹھائی جاتی ہے؟ یارو اتنا بھی غلو نہ ہونا چاہئے کہ حقیقت کو تسلیم ہی نہ کیا جائے۔

مخالفت اہل عجم یا اہل کتاب کی؟

امام صاحب اشارہ فرماتے ہیں کہ ــــ احادیث و اقوال میں کہیں تو اہل کتاب کی مخالفت کا ذکر ہے اور کہیں اہل عجم اور ایرانیوں سے مختلف رہنے کا حکم ــــ تو اس بہانے "مخالفت" کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ دونوں کی مخالفت شارع کا مقصود

اور ہر غیر عربی فلسفہ اور کردار کو جھٹلانا مطلوب شرع ہے (صفحہ 29/6 تا 8)

تبصرہ: نبی — اللہ کے فرامین اور احکامات کو ہر انسان تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔ وہ اگر ممکن ہونے کے باوجود کسی فرد بشر تک پہنچنے میں دشواری محسوس کرے توحید اور اوامر الٰہی کے ابلاغ میں کاہلی اختیار کرے یا ذاتی وجوہ کو سامنے رکھ کر خطاب کا اہل نہیں سمجھا تو اس نے گویا اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں کیا۔ ارشاد ہے **بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ** .... (المآئدۃ - 67)

اے نبی محتشم صلی اللہ علیک و سلم تم اللہ کے نازل کردہ ہر حکم کو (ہر انسان تک) پہنچانے کے ذمہ دار ہو اور اگر کوتاہی ہوئی تو یوں سمجھئے کہ اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں کیا

اور اتنی بڑی ذمہ داری کو نبھانے کے لئے ضروری ہے کہ نصاریٰ و مشرکین ہوں خواہ مجوس و دیگر غیر عربی اقوام ہوں' ان کے پاس خیر سگالی کے جذبات (ناصح امین) لے کر ان تک رسالت خدا کو پہنچائیں۔ دل میں اگر منفی جذبہ رکھ کر "فاصلے" اور قطع کی راہیں اختیار کریں گے تو وصل اور قربتوں کا فلسفہ کیسے پروان چڑھے گا؟ آپ ﷺ کفار مکہ اور طائف پر اپنا مشن پیش کر کے اذیتوں کے سیلاب کا مقابلہ کر کے ایک مثال قائم کر لیتے ہیں تو اہل کتاب یا دیگر غیر مسلم مگر مہذب اقوام سے کیوں کر رابطہ شکن رویہ اختیار کر سکتے تھے؟ آپ ﷺ پوری کائنات بشری کے لئے رسول تھے۔ نذیر اور بشیر تھے (مدثر 36) آپ ﷺ نے ہر ایک کے پاس جانا ہے۔ ابن تیمیہ کس اتھارٹی سے آپ کا راستہ کاٹ رہے ہیں؟ پھر یہ بھی خوب کہی کہ آپ ﷺ صرف عربی کلچر کو مسلط کرنے کے لئے ان تمام طبقوں سے بائیکاٹ کے مکلف تھے — مانا کہ ایسا ہی ہو گا لیکن پھر آپ ﷺ تبلیغ کس مخلوق کو کرنے آئے تھے؟ حیوانات و جمادات کو؟ — **العیاذ باللہ** — جبکہ قرآن محکم کہتا ہے کہ آپ ﷺ کے مخاطبین

میں وہ لوگ بھی ہیں جو ہدایت و رہنمائی پا چکے تھے —— آپ ﷺ ان سے قربت کے رابطے بڑھایئے اور ان کی اچھی باتوں کا اعتراف کر کے (اپنی طرف مائل کیجئے)

نیز فرمایا—— یہود و کفار کو چھوڑیئے' نصاریٰ کو دیکھئے کہ ان میں ایسے بھی لوگ ہیں جو مسلمانوں سے پیار کا رشتہ جوڑے ہوئے ہیں کیوں کہ ان میں دین کا شعور رکھنے والے **قسیس** PRIESTHOOD اور "**رہبان**" ہیں قرآن سنتے ہی ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتی ہیں۔

(مائدہ —— 83)

ایسی وضاحتوں کی موجودگی میں ابن تیمیہ کا یہ فلسفہ کہ نبی کو بائیکاٹ کی پالیسی پر عمل پیرا ہونا چاہئے' ایک ناکارہ اور گمراہ کن فلسفہ ہے۔

ابن تیمیہ کی حمایت میں:

ابن تیمیہ کی یہی کتاب حضرت شیخ المکرم شرف الحق صاحب مرحوم ڈیانوی کے مطالعہ میں رہا کی اور ان دنوں آپ سنن ابی داؤد کی بے نظیر شرح—— "**عون المعبود**" کی چوتھی اور آخری جلد کی ترتیب و تدوین میں مصروف تھے تو آپ نے بھی رجال کی اس کھیپ سے گھبرا کر ہمنوائی میں لکھ دیا کہ:

"ان دلائل کی رو سے تمام علماء نے بالاتفاق فرمایا ہے کہ ہر قسم کے غیر مسلموں کا لباس میں **تشبہ** اختیار کرنا مکروہ ہے۔

(عون المعبود طبع اول' دہلی جلد 4 / 78)

شیخ الحدیث نے حرام کی بجائے مکروہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ نامعلوم مکروہ سے ان کی مراد وہی "فقہی" حرمت مراد ہے یا اس سے کم درجے کی برائی؟—— بہرحال امام بن تیمیہ ہمارے احوال و ظروف اور جغرافیائی حالات سے مطلق بے خبر تھے انہوں نے اگر ایک تنگ اور محدود دائرے میں رہ کر ایک خاص ذہن کی ترجمانی کرتے ہوئے غیر عربوں کی مشابہت کو علما کے "اتفاق" کا رنگ دے بھی

دیا ہے تو وہ قابل فہم ہے کہ وہ مجبور تھے جبکہ عون المعبود کے مصنف ایک آزاد مملکت کے فرزند تھے' وہ صحیح ادراک کر سکتے تھے کہ حدیث **من تشبہ** کا سلبی پہلو لیں خواہ ایجابی' دونوں لحاظ سے مفید مطلب نہیں ہو سکتی کیونکہ ہم انگریزوں کے زیر سایہ مخلوط معاشرے کے فرد تھے۔ ہم احتیاط کے باوصف "مشابہت" سے کلی طور پر نہ بچ سکتے تھے۔

بہار کا مسلمان ۔۔۔قلات کا ہندو

فرض کرو ہم ابن تیمیہ کا سادہ سا مفہوم لیں اور کہیں کہ غیر مسلموں کی مشابہت سے لباس کی مشابہت ہی مراد ہے تو فرمایا جائے کہ بہار' برار اور بنگال کے مسلمانوں کو ہم کس بناء پر مسلمان قرار دے سکتے ہیں۔ جب کہ ان کی اور پنڈت دیوانند کی دھوتی باندھنے کا ایک ہی طریقہ ہے ۔۔۔ پھر اس کا سلبی مفہوم سامنے لا کر فرمایئے کہ قلات و لنڈی کوتل کے ہندوؤں کو کیوں کر مشرک کہا جائے گا جبکہ وہ مسلمانوں کی شلوار اور قراقلی ٹوپی استعمال کرتے ہیں ۔۔۔؟ کیونکہ اسلام اور کفر میں حد فاصل جب لباس ہی ٹھہرا تو اس "امتیاز" کی کیا صورت باقی رہ سکتی ہے؟

ہمارے وطنی بھائی ایک دو نہیں' لاکھوں کی تعداد میں دول یورپ کی طرف ہجرت کر کے جا بسے ہیں یا روزگار کی خاطر "سوئے یورپ" رواں دواں ہیں۔ وہاں ورک پرمٹ حاصل کر کے روزی کما رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ وہاں نہ شلوار قمیص ہوں گے نہ چادر اور کرتا۔ انہوں نے ہر حال میں دیار غیر میں "**اضحوکہ**" بننے کی بجائے وہاں کا رائج اور مقامی لباس پہن کر ہی اپنے کو ان کی سوسائٹی میں کھپانے کے جتن کرنے ہوں گے۔ ایسے میں ان پر کلی مشابہت کی فرد جرم لگا کر خنجر "تشبہ" سے گھائل کرنا بڑی زیادتی ہو گی۔ ابن تیمیہ اور دیگر صاحبان علم کو چاہئے تھا کہ پہلے مرحلے ہی میں "**من تشبہ بقوم فھو**

منہم "کی دو دھاری تلوار کو آلۂ "سفاکی" بننے نہ دیتے۔

(13) امام عبدالرؤف منادی کی اپنی رائے نہایت مناسب اور بر محل ہے کہ وہ ایسی احادیث کو ہنگامی مصلحتوں اور وقتی مناسبات سے متعلق قرار دینے کے علاوہ پوچ اور ضعیف بھی قرار دے دیتے تھے تاہم بندہ بشر تھے۔ سلفیوں کی کھیپ کے سامنے ٹھیرنے کی رندانہ جرات نہ کرسکتے تھے۔ انہوں نے جو ایک دو اقوال نقل کئے ہیں ان سے مترشح ہوتا ہے کہ اس مسلم کش حدیث کا تعلق آپ کے نزدیک بھی لباس ہی سے ہے۔ چنانچہ محدث ابن رسلان (1300م) کا قول نقل کیا ہے کہ نیلے یا پیلے رنگ کا لباس پہننا' عمامہ باندھنا بھی **من تشبہ** کی رو سے حرام ہے۔

(شرح جامع طبع مصر1938' جلد 6 / 104)

تبصرہ: جب مطلق لباس میں غیر عربوں سے مشابہت ممنوع ہے تو رنگ کی تخصیص ہمارے لئے کوئی زیادہ معنی پیدا نہیں کرتی تاہم ابن رسلان کے اس فتوے پر "دیوہ" شریف کے مجاور اور خلیفے غور فرماسکتے ہیں۔

کثرت احتمال: ان اقوال کی روشنی میں دیکھا جائے تو آج تک پوری قطعیت کے ساتھ اتنا بھی واضح نہ ہو سکا کہ اس حدیث کا ایک اور اصل مفہوم کیا ہے۔ علاوہ اس کے یہ حدیث کس پائے کی ہے؟ ان احتمالات کی موجودگی میں کسی ایک خاص عمل کا یقینی تعین اور پھر اسکی حرمت کا فیصلہ اتنا ہی دشوار ہے جتنا کہ پانی سے چراغ جلانا کیوں کہ اصول فقہ کی کتابوں میں پوری صراحت سے موجود ہے کہ — **اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال** — احتمالات کی موجودگی میں کسی امر خاص (کی حرمت و حلت یا کفراور اسلام) پر استدلال کرنا باطل ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اس طرح معاملہ ہمیشہ یقین اور شک کے مابین لٹکا رہے گا۔ جبکہ یقینیات کی بنیاد شک پر نہیں رکھی جاسکتی۔ اس لحاظ سے یہ حدیث جسے ہزار منہ

والا اژدہا کہنا بے جا نہ ہوگا۔اس قابل نہیں کہ اس پر فقہ اسلامی کے ایک اہم حصہ کی باب بندی کی جائے۔ لہٰذا اس کی ہمہ گیر گرفت تسلیم کرنا وہم اور شریعت کے اندر ایک نئی اور متوازی شریعت کو جنم دینے کے برابر ہے۔

مخالفت ہی مخالفت: امام صاحب نے اپنے موقف کی کمزوری کو محسوس کرتے ہوئے ذہن پر ابھرتے ہوئے ایک سوال کا جواب ارشاد فرمایا ہے کہ اگر غیر مسلموں کو حکم دیا جائے کہ وہ اپنے لباس کے لئے فلاں (خاص) رنگ اپنائیں اور وہ ایسا ماننے پر تیار نہیں ہوتے تو یہاں فقہا اور محدثین میں اختلاف ہے کہ خود ہم ہی اپنے لباس کا کوئی سا رنگ مخصوص کرلیں ــــ پھر ایسا بھی ہونا شروع ہوگیا کہ وہ غیر مسلم بھی آہستہ آہستہ ہمارا ہی پسند کردہ رنگ اختیار کرتے جارہے ہیں تو ہمیں مشابہت سے بچنے کے لئے از سر نو کوئی اور رنگ خاص کرنا ہوگا۔

(صفحہ 59 سطر 10 تا 12)

مقصد یہ کہ جہاں زور چلے تو وہاں ڈنڈے سے مخالفت کرو اور جہاں پوزیشن برابر ہو تو آنکھ مچولی سے دین کا بیڑہ غرق کرو۔ ایک رنگ کو خاص کرنا بھی دین ہے۔ اور اسے چھوڑ دینا بھی دین؟ دین نہ ہوا گرگٹ کے رنگ ہوئے ــــ واہ ابن تیمیہ ــــ رنگ و نسب کے چکر میں ایسے پڑے کہ دین کی مبادیات تک کو نظر انداز کردیا!!

مخالفت کی نفسیات: اگر امام ابن تیمیہ کی دینی نفسیات کو غائر نظر سے دیکھا جائے تو معاملہ کی تہہ تک پہنچنا آسان ہو جائے گا۔ یعنی امام موصوف کی ولادت سے عرصہ دو سال بعد ــــ 1263 م ــــ میں اسلام کا زور توڑنے کے لئے تاتاریوں نے سلطنت اسلامی پر پے در پے ایسے مہلک وار کئے جن سے بلاشبہ اس کا جاں بر ہونا ــــ ناممکن ہو گیا تھا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ حملہ آور بظاہر عام اصطلاح میں عجمی ہی تھے جن کی زبان بھی عربی نہیں تھی پھر مزید حادثہ یہ پیش آیا

کہ تاتاریوں کی یہ تباہ کن یلغار ایک عجمی مسلمان کے توجہ دلانے پر ہی ہوئی۔ ایسے میں آپ نے "عنصری" دہائی کی ترجیح دے کر عامتہ المسلمین کے شعور کو عرب کی حمایت پر آمادہ کرنے کے لئے ان ضعیف اور وضعی اور خود ساختہ احادیث و اقوال کا سہارا لیا جنہیں عام حالات میں عربوں کا سنجیدہ طبقہ بھی پسند نہ کرتا تھا۔

نیز امام موصوف افکار و عقائد کے لحاظ سے جس مسلک (حنبلی) کے حامل تھے' وہ تشدد اور تصلب میں خاصی شہرت رکھتا تھا— عابدین کا مسلک تھا' جامدین کا مسلک تھا' ان کا ذہن سلفیت میں اتنا سخت گیر تھا کہ وہ ادنیٰ سی رواداری کا قائل بھی نہیں تھا بلکہ وہ رواداری اور لچک کے موٹے اصولوں سے بھی نابلد محض تھا۔ وقتی تقاضوں اور بدلتے ہوئے حالات کا ادراک ہی نہ کر سکتے تھے— معروضی حالات سے ہم آہنگ ہونا ان کے مسلک میں خالص کفر تھا— اور اسی ہی ذہنیت کے حامل ابن تیمیہ نے جو کچھ لکھا' وہ قرین قیاس تھا کیوں کہ وہ بھی ایک انسان تھے جس کے عواطف' میلانات' اور احساسات کا محور بلاشبہ غیر عربوں کی برتری اور بالادستی کی نفی کرنا تھا۔ چنانچہ ذیل کے عنوان میں امام موصوف اپنی زبانی آپ ہی بول رہے ہیں۔

ابن تیمیہ اور نسلی امتیاز۔

امام صاحب نے "**اقتضاء الصراط المستقیم**" میں صفحہ 28 سے لے کر ص 81 تک پورا زور اس بات پر صرف کیا ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں اس لئے تشریف لائے تھے کہ عرب کو سربلند کریں اور عربوں کے مخالفین کا پوری طرح استیصال و بیخ کنی کریں۔ اور یہ پالیسی جب تک عجم نے اسلام قبول نہیں کیا عرب کی سربلندی تک محدود رہی لیکن عملی طور پر عجم کے مسلمان ہونے کے بعد بھی عربی بالادستی کے اثرات کو دانستہ فروغ دیا گیا جس

سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اسلام کا اصل منشاء کیا تھا۔

امام موصوف کا یہ انتہاپسندانہ رویہ جہاں اسلام کے اصول مساوات کے منافی تھا وہاں اس کی زد ان صحابہ کرام پر بھی پڑتی تھی لہٰذا تھوڑی سی مرہم پٹی کے بعد سلمان فارسی ؓ اور دیگر اصحاب علم و فضل کو معاف کر ڈالا لیکن معا بعد رگ تعصب پھڑک اٹھتی ہے اور اب کی بار اتنا شدت سے روٹھتے اور غیر عربوں کے زخموں پر اتنی زور سے نمک پاشی کر ڈالتے اور اشہب قلم اتنا بے قابو ہو جاتا ہے کہ عرب کی مخالفت کو خود اسلام کی مخالفت سے تعبیر کرنے کے علاوہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ:

عجمی مسلمانوں کی لڑکیوں سے نکاح تو کیا جا سکتا ہے مگر عربی لڑکیاں بیاہ دینا جائز نہیں ہے۔ یہ امتیاز اسلام کے بعد بھی باقی رکھا گیا اور باقی ہی رہنا چاہیے

کیوں کہ حضرت عمر بن الخطاب ؓ جب مال غنیمت تقسیم فرماتے تھے تو سب سے پہلے اہل بیت پھر اہل عرب کو حصہ دیتے اور جب ان سے فارغ ہو جاتے تو عجمی مسلمانوں کو یاد فرماتے ــــ اور تقدیم کے اسی تناسب سے عربوں کو زیادہ اور عجمیوں کو کم حصہ دیتے۔ اسی طرح خلفاء ثلاثہ ؓ اور بنی امیہ اور بنی عباس کا یہی ترجیحی وطیرہ رہا۔ (صفحہ 21/77-76)

تبصرہ: اگر حقیقت الامر اسی طرح تھی کہ عجمیوں سے یہ امتیاز روا رکھا گیا اور رکھنا چاہیے بھی تو کوئی وجہ نہیں کہ دین کی تعبیر میں وہ ایک الگ مسلک متعین نہ کریں اور برملا کہہ ڈالیں کہ رسول اکرم ﷺ نے خطبہ وداع میں عجمی پر عربی فضیلت اور ترجیح کی جو نفی کی تھی اسے آپ ؐ کی اپنی ہی قوم نے تسلیم نہیں کیا۔ اب وہ رسول مساوات بھی نہیں رہے (العیاذ باللہ)۔

عربی لڑکی کا عجمی مسلمان سے نکاح ناجائز ہے: ابن تیمیہ واقعہ تقسیم وظائف کو اپنی تائید میں اس انداز سے نقل فرماتے ہیں جیسے وحی الٰہی نے تصریح فرمادی ہو کہ عجمی ہر سطح پر عربوں سے کمتر درجے کے انسان ہیں بلکہ چند ہی سطور پہلے رقم طراز ہیں کہ:

اکثر فقہاء اور امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ اگر کسی عجمی مسلمان نے کسی عربی لڑکی سے نکاح کر بھی لیا تو "**کفو**" (ہم قوم) نہ ہونے کی وجہ سے طلاق کے ذریعہ ان میں تفریق کرالی جائے گی (صفحہ 76 / 19 تا 23)

کیوں کہ عجمی مسلمان کو شوہر کی فضیلت حاصل ہونے سے عربی عورت سے مساوی پوزیشن حاصل ہو گی اور یہ چیز اسلام کو مطلوب نہیں ہو سکتی!!

بالکہ ابن تیمیہ کی جسارت ملاحظہ ہو کہ اسی باب میں خود ایک عجمی صحابی حضرت سلمان فارسیؓ کی زبانی ایسی روایات ترشوادیں جو ان کی تائید میں ہیں

یعنی سلمانؓ کہتے ہیں کہ عرب کی فضیلت کے پیش نظر عجمی مسلمان نہ توان کی لڑکیوں سے نکاح کرسکتے ہیں اور نہ ہی عربوں کی نمازمیں امامت کراسکتے ہیں۔(صفحہ 76 از اول تا آخر)

کیوں کہ نکاح اور امامت کی وجہ سے عجمی کا پکڑا جھکنے لگے گا اور یہ بڑا غضب ہو جائے جبکہ حنبلی فقہاء کی منشاء کے برعکس سب سے بڑے مالدار اور گورے چٹے صحابی حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ (652م) نے عربی ہو کر بھی "**کفو**" کی شرط کی پرواہ نہیں کی اور اپنی ہمشیرہ "ھالہؓ" (HALA) سب سے زیادہ نادار اور سیاہ فام حبشی بلال سے نکاح کر دیا۔

(ابن حجر' اصابہ طبع مصر جلد 4 / 406)

افضیلت عرب کے دلائل

امام صاحب "**افضلیت**" عرب کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ ـــــ

الذی علیه اهل السنه والجماعة اعتقاد ان جنس العرب افضل من جنس العجم عبرانیّهم وسریانیّهم رومهم وفرسهم وغیرهم" الخ

اہل سنت والجماعت کامتفقہ عقیدہ ہے کہ جنس عرب ـــــ جنس عجم سے افضل ہے۔ عبرانی ہوں خواہ سریانی' رومی ہوں خواہ ایرانی غرضیکہ تمام اقوام سے جنس عرب افضل ہے۔ اور

عرب میں افضل قریش ہیں اور قریش میں بنی ہاشم اور بنی ہاشم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔
(صفحہ 12/17 تا 14)

تبصرہ: ابن تیمیہ کی یہ عنصری و جنسی تفریق روح اسلامی کے سراسر منافی ہے اور کوئی بھی غیور انسان اس تعلیم کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ دنیا کی نظر تو نبی البشر صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان پر ہے جو میدان عرفات میں آپ نے صادر فرمایا تھا کہ:

"کالے کو گورے پر اور جنس عرب کو جنس عجم پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ سب اولاد آدم ہیں اور آدم زمینی مخلوق تھے۔" اس انسانیت نواز فلسفہ نے بلال حبشی رضی اللہ عنہ کو ابو جہل اور صہیب رومی رضی اللہ عنہ کو عبداللہ بن ابی کے نہ صرف ہم پلہ قرار دے دیا۔ ان ہر دو عربی سرداران کے سر سے افضلیت کا تاج اتار کر حبشی اور رومی کے سر پر رکھ بھی دیا۔

جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت کا تعلق ہے تو اس میں کیا شک ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف افضل البشر تھے—— سید البشر بھی تھے مگر آپ ؐ کی افضلیت قرآن کی زبان میں یہ تھی کہ آپ ؐ "**انما یوحی الی**" کے حامل تھے اور یہ وہ اعزاز ہے جس کا ادراک نہ ابن تیمیہ کر سکتے ہیں نہ کوئی دوسرے جنس پرست انسان۔ بلاشبہ آپ ہاشمی تھے لیکن ابن تیمیہ نے جس غرض کے لئے آپ کو ہاشمیت کے امتیاز سے نوازا ہے' اس کی اصلیت ہے نہ اساس۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح عربی لڑکی کا عجمی مسلمان سے نکاح نہیں ہو سکتا' اسی طرح سید زادیاں بھی امتیوں سے نہیں بیاہی جا سکتیں لیکن رسول اللہ جاہلیت کے اس رواج کو نہیں مانتے آپ کے تین داماد تھے اور تینوں ہی سید نہیں تھے۔ قریش ضرور تھے مگر ہاشمی اور پھر سید نہیں تھے۔

ابن تیمیہ صاحب! جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو

"موجۂ ہستی" کنارہ طلب تھی اور اسے محمدؐ کی صورت میں کنارہ مل گیا۔ یہ کنارہ پورے نوع بشر کی نجات کے لئے تھا۔ رسول اپنی عالمی ذمہ داریوں سے غافل نہیں تھے۔ وہ اپنے قریب آنے والوں کو مایوس نہ کر سکتے تھے کیونکہ وہ عالمی رسولؐ تھے۔ آفاقی ضابطہ ہدایت و نجات ساتھ لائے تھے۔ چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ رسولؐ مساوات نے "زمان" کو بولنے کی نئی زبان یعنی قرآن محکم دے دیا اور قرآن نے عالمی احساسات اور نوع بشر کی قربت اور رابطہ پر زور دے کر "ملاپ" کے ڈھنگ سکھائے اور "مکان" کو ٹھہرنے کے لئے حوصلہ دیا یعنی اسلام نے تشخصات و پہچان کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے اندر ہر ایک کو پناہ دی۔

ابن تیمیہ کا مسئلہ :

امام صاحب بڑے ذہین، فطین اور حساس تھے مگر ردعمل نے آپ کی نفسیات کو منفی رنگ میں رنگ دیا تھا۔ آپ محب وطن بھی تھے اور حب عرب سے سرشار بھی اور کوئی عیب بھی نہیں ہے لیکن چونکہ آپ بنیادی طور پر "منفیت" پسند بھی تھے اور فلسفہ تنازع للبقاء کے حامل تھے۔ تاتاریوں نے جب عرب کی زمین پر تباہی مچائی اور بڑے بڑے صنادید علم و ادب اس خونی ریلے میں بہ گئے۔ آپ نے اس حادثہ کے 14، 15 سال بعد جب شعور کی آنکھ کھولی اور گرد و پیش کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ تاریخ کے زندہ کردار تمام تر مٹا دیئے گئے ہیں۔ اب آپ کے قلب حساس نے شدت سے محسوس کیا کہ تاتاری بھی عجمی تھے اور ان کو بلانے والے وزیر ابوطالب محمد بن احمد بن علی عرف ابن علقمی (1258م) نیز عجمی تھے جو عرب معاشرے میں بہت اونچا مقام رکھنے کے باوصف "عجمی افضلیت" کا عقیدہ رکھتے تھے لیکن اس نے عربوں کی افضلیت کا شدید نوٹس لیا اور ان سے انتقام لینے کے لئے ہلاکو خاں (1265م) کو "یلغار" کی دعوت دے دی۔ ابن تیمیہ ان روح فرسا مناظر کو ہمیشہ چشم تصور میں رکھتے

اور اسلامی مبادیات کو عربوں کی سربلندی اور افضلیت سے مربوط کرتے تھے حالانکہ اسلام یا رسول علیہ السلام کے سامنے ہمیشہ ایک ہی مقصد ہوتا تھا کہ **توافق للبقاء** کو فروغ دے کر پیغام الٰہی کو گھر گھر پہنچا دیا جائے کہ "تنازع" سے "توافق" زیادہ مثمر اور نتیجہ خیز ہوتا ہے۔

افضلیت عرب کے مزید دلائل :

(1) امام صاحب عجمی مسلمانوں پر عربوں کی فضیلت کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ

ابو محمد حرب بن اسماعیل نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ — عرب سے محبت کرنا ایمان اور بغض رکھنا نفاق کی علامت ہے — اس قول سے ہمارا مقصد "قومیت" عربیہ کو ہوا دینا نہیں ہے اور سب سے ذلیل تو وہ "موالی" (عجمی نو مسلم) ہیں جو نہ تو عرب سے محبت کرتے ہیں اور نہ ہی ان کی نسلی برتری کا اعتراف" (صفحہ 70) احمد بن سعید **اصطخری** نے امام احمد بن حنبل اور دیگر بہت سے اہل علم سے بھی ایسا ہی بیان کیا ہے۔ (صفحہ 71)

(2) (ابن تیمیہ کی ذاتی رائے) ایک فرقہ ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ **لا فضل لجنس العرب علی جنس العجم وھولاء یسمون الشعوبیہ** یعنی جنس عرب کو جنس عجم پر کوئی برتری نہیں ہے یہ لوگ دراصل "شعوبیہ" ہیں (صفحہ 17)

شعوبیہ ایک خاص اصطلاح ہے جو ازرہ نفرت ہر اس مسلمان کے حق میں استعمال کی جاتی تھی جو عرب افضلیت کا اعتراف نہ کرتا تھا

(منجد الاعلام طبع بیروت — آخری ایڈیشن صفحہ 289 کالم نمبر 2)

(3) (امام موصوف کی ایک اور رائے) کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ عجم کی بعض قومیں عرب سے افضل ہیں — تو یہ بات ماسوائے منافق کے کوئی بھی نہیں کہے گا۔ پھر وہ (مسلمان ہو کر بھی) عقیدتاً — منافق ہو یا عملاً — ہم ان کو (مسلم ہونے کے باوجود) اس لئے منافق کہیں گے کہ حدیث میں آیا ہے کہ عرب کی محبت ایمان اور عرب سے عداوت نفاق ہے۔" (صفحہ 72)

تبصرہ: امام صاحب جو چاہیں فیصلہ جڑ دیں ان کے اوہام و ظنون کی کوئی حقیقت

نہیں ہے۔ اہل بدعت نے ہر موضوع پر حدیثیں بنا رکھی ہیں۔ انہیں آنکھیں موند کر قبول کرنے والے کتنے ہی اونچے مقام پر فائز ہوں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم پر جھوٹ بولنے والے عادی جہنمیوں کی تصدیق کرکے اپنے مقام سے فروتر چلے گئے ہیں تاہم اگر ایسے ہی پوچ استدلات سے کام لیا جائے تو بنی اسرائیل سب سے زیادہ افضل ثابت ہوتے ہیں فرمایا— **انی فضلتکم علی العالمین** — میں نے تمہیں سب پر برتری دی ہے (بقرہ' 43) خاص کر جب نہ فضیلت کی وضاحت ہے نہ العالمین میں کوئی استثنا تو کیا یہ تشریح منظور ہے؟

(4) رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ — اے سلمان مجھ سے بغض رکھو گے تو دین سے نکل جاؤ گے۔ اس پر سلمان رضی اللہ عنہ نے سراسیمہ ہو کر کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیک السلام آپ ہی کے طفیل دولت ایمان میسر آئی' آپ ہی سے بغض؟— آپ ؐ نے فرمایا کہ ہاں **تبغض العرب فتبغضنی** — تم عرب سے بغض رکھو گے تو مجھ سے بغض رکھنے کے برابر ہے۔" (ص 72 بحوالہ ترمذی)

تبصرہ: اس روایت میں ایک بے بنیاد راوی ابو بدر شجاع بن الولید واقع ہے جس کے بارے میں امام صاحب کو خود بھی اعتراف ہے کہ نامعلوم شخص ہے— کتب حدیث میں اس سے صرف یہی ایک روایت ہی مروی ہے۔ اس کے باوجود اس بے اصل روایت سے استدلال کرتے ہوئے ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ **فقد جعل النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلم بغض العرب سببا الفراق الدین وجعل بغضھم مقتضیا لبغضہ**

نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم نے جو الفاظ سلمان فارسی سے ارشاد فرمائے' یہ بجائے خود دلیل ہیں کہ آپ نے حقیقت میں عرب سے دل میلا رکھنے کو اسلام سے خارج ہونے کے برابر جرم قرار دیا نیز ان سے بغض رکھنے کو اپنی ذات گرامی سے عداوت رکھنے کے مساوی ٹھہرایا—
(صفحہ 72/22 تا 25)

نیز ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

(5) یہ حدیث بڑی دلیل فراہم کرتی ہے کہ جنس عرب سے عناد رکھنا کفر ہے یا کافر بننے کا ایک سبب (صفحہ 75)——نیز ارشاد ہے۔

(6) حرب کرمانی مذکورہ حدیث سے منکرین افضیلت عرب کی تکفیر پر استدلال کرتے اور کافر کہتے تھے تاہم مانتے تھے کہ اسنادی پہلو سے یہ حدیث محل نظر ہے (صفحہ 75)

تبصرہ: یہ حدیث اسنادی حیثیت سے محل نظر بھی ہے اور ابن تیمیہ جیسے ناقد الحدیث کے نزدیک کافر بنانے کی سکت بھی رکھتی ہے **یا للعجب**: پھر تائید میں ذیل کی حدیث کا سہارا نیز لیتے ہیں۔

(7) جس نے کسی عربی سے لین دین میں یا دیگر معاملات میں بلیک میلنگ کی——وہ میری شفاعت سے محروم اور میں اس کی دوستی سے دور——(صفحہ 75 بحوالہ ترمذی)

تبصرہ: اس حدیث میں حسین بن عمر الاحمسی جیسا نالائق' فرقہ باز اور کذب تراش راوی' اگرچہ امام صاحب کو کھٹک رہا تھا تاہم برا ہو نسلی تعصب کا کہ آپ نے اس جیسے نابکار اور ناہنجار راوی کو بھی اپنی تائید میں لا کھڑا کیا اور لکھ دیا کہ

بلیک میلنگ میں بھی تحت الشعوری نفرت ہی کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔ لہٰذا اس (جھوٹی) حدیث کے مضمون کو راوی کی حیثیت سے الگ کر کے دیکھنا ہوگا اور نمبر 4 کے مضمون سے ملا کر نتیجہ اخذ کیا جائے گا کہ عرب سے نفرت دین اور ایمان سے خارج ہونے کے برابر ہے۔ (صفحہ نمبر 75)

تبصرہ: یہاں امام صاحب سلفی اصولوں سے ہٹ کر راوی کی حیثیت کو نظرانداز کر کے روایت کے مضمون پر نظر رکھتے ہیں جو کہ ان کی درایت و سوچ کے مطابق گوارا ہے حالانکہ قرآنی پالیسی کے خلاف ہونے کے باعث مضمون خود بھی سقیم اور مکڑی کے جالے سے زیادہ کمزور ہو چلا ہے۔ غالباً امام صاحب نے "مضمون" کا سہارا لے کر اپنے تئیں روایت کو دلدل میں پھنسنے سے بچا لیا ہے لیکن اسی موقع پر **روح الاجتماع** کے فرانسیسی محقق لیبان نے کہا ہے کہ——

مختلف اشخاص کی زبانی کسی بات کا بار بار اعادہ اور تکرار ایک ایسی چیز ہے جو حقیقت واقعہ کا "قلب ماہیت" کرلیتی ہے، یعنی مفروضہ کو حقیقت بنا سکتی ہے بلکہ ہمارے دور کے نامور المانوی پروپیگنڈسٹ گوئبلز بھی یہی کچھ کہتا تھا جو ابن تیمیہ فرما رہے ہیں —— یعنی ایک جھوٹ کو جب مختلف اشخاص کی زبانی دہرایا جائے تو ایک خاص مرحلے پر اعلیٰ قسم کا سچ شمار ہونے لگتا ہے۔

(8) حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ عرب سے صرف منافق ہی بیر رکھ سکتا ہے۔ (صفحہ 76 بحوالہ مسند احمد)

تبصرہ: اس روایت میں زید بن جبیر جیسا گمنام راوی ہے۔ اس کا ابن تیمیہ کو بھی اعتراف ہے مگر خاموشی سے آگے بڑھ جاتے ہیں کیوں کہ یہاں بھی ان کا استدلال ہے کہ راوی گمنام یا جھوٹا سہی مگر حدیث کا مضمون روایت نمبر4 سے ملتا ہے۔ یعنی لیبان کے بقول جھوٹ کو مختلف اشخاص کی زبانی پھیلایا جائے تو سچ بن جاتا ہے۔ لیکن افسوس کہ محدثین مضمون سے زیادہ سند پر نظر رکھتے ہیں کہ سند ہی سے حدیث کی صحت یا سقم معلوم ہو سکتا ہے۔

(9) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— تین وجوہ کی بناء پر تم عربوں سے محبت کرو۔ (I) میں عربی ہوں، (II) قرآن عربی میں ہے، اور (III) اہل جنت کی زبان بھی عربی ہوگی۔
(صفحہ 76 بحوالہ ابو جعفر حافظ السلفی)

تبصرہ: امام ابن تیمیہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ روایت ناقابل استدلال اور باتفاق محدثین "وضعی" ہے—— لیکن کیا جھوٹ کو جھوٹ کہنے کے باوجود معرض استدلال میں پیش کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان باندھنے کے برابر نہیں؟

(10) امام صاحب اس پر ہی اکتفا نہیں فرماتے بلکہ (بزعم خویش) ان قطعی نصوص (جھوٹ اور نصوص؟) کے بعد بھی آپ کو عرب کی فضیلت کا فلسفہ بار بار دہرانا پڑا—— یہ مضمون اچھا خاصا طویل ہے۔ بلکہ گوئبلز سے عالم ارواح کی

استادی و شاگردی کی برکات سے خاصا طویل ہے ذیل میں چند سطری خلاصہ عرض کر رہا ہوں۔ فرماتے ہیں کہ:

عرب عقل اور ذکاوت میں' — فصاحت اور بلاغت میں — جود و سخا میں — جزرسی اور باریک بینی میں — عمدہ اخلاق اور شریفانہ اعمال میں ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں اور قاعدہ یہ ہے کہ دنیا میں افضلیت اور علم ہی وہ چیز ہے جسے مصدر عقلی کہا جاتا ہے اور عقل کا تعلق حافظے اور فہم سے ہے اور حافظہ و فہم جس قوم کو عطا ہوا اس کی منطق (زبان) فصیح اور بیان و تعبیر کے لحاظ سے اعلیٰ ہو گی اور جس قوم کی زبان اعلیٰ ہو گی اس کا فہم قطعی اونچا ہو گا۔ لہٰذا ان اوصاف اور اسباب کی بناء پر عرب ہی افضل الاجناس ہیں اور عجم پر بلاشبہ ان کو برتری اور فوقیت حاصل ہے۔"
(صفحہ 77 / 20 تا 23)

تبصرہ: امام ابن تیمیہ اگر بات کو طول نہ دیتے اور پہلے ہی مرحلے پر سچ کو جھوٹ کا سہارا فراہم کرنے سے احتراز کرتے تو نہ روایت سازی کے مجرم بنتے نہ جھوٹی روایات ڈھونڈ کر لاتے اور نہ نبیؐ کا دل دکھاتے — بلاشبہ اس آخری شذرے میں بہت سے حقائق کا اظہار ہے لیکن عنصری برتری کا نظریہ پھر بھی روح قرآن اور اسلام کی آفاقی پالیسی کے خلاف ہے — کہاں تشتبہ — کی بات اور کہاں عرب کی فہم و فراست میں برتری؟ آخر کوئی تو مناسبت دکھلائی جاتی!! پھر جو کچھ عربوں کی بابت کہا گیا ہے' طے شدہ نہیں ہے۔ فہم و ذکاء میں بہت سی قومیں ان کی ہمسر ہیں یا آگے نکلی ہوئی ہیں۔

مخالفت میں عجمی کفار اور مسلمان برابر ہیں

فاذ انھت الشریعه عن مشابھه الاعاجم دخل فی ذالک ماعلیه الا عاجم الکفار قدیما و حدیثا و دخل فی ذالک ما علیه الاعاجم المسلمون مـالم یکن علیه السابقون الاولون

جب شریعت نے عجمیوں کی مشابہت سے کُلی طور پر روک دیا ہے تو جان لینا چاہئے کہ اس "روک" میں قدیم خواہ موجودہ عجمی کفار — برابر شامل ہیں۔ اسی طرح اس "روک" میں **سابقون الاولون** (صحابہ کرام) کے ماسوائے تمام عجمی مسلمان بھی داخل ہیں۔

(صفحہ 77 / 26 تا 28)

تبصرہ: غور فرمایئے جب آپ کے دل میں قوموں و قبیلوں کے خلاف تعصب اور نفرت کا مواد بھرا ہو گا تو آپ اخلاق کے کس عنوان سے ان کو اپنی جانب مائل کریں گے؟ جبکہ وہ مسلمان ہو کر بھی آپ کی برادری کا فرد نہیں بن سکتے— کیا عجمی اتنے ہی گئے گزرے یا قابل نفرت ہیں کہ آپ قدم قدم پر ان سے حقارت کا مظاہرہ کریں اور وہ لازمی حد تک تمہارے قدم چومتے رہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ ہمارے اسلاف کو اتنا بھی خیال نہیں آیا کہ وہ قرآن کی حامل اور مبلغ قوم سے تعلق رکھتے ہیں جہاں آپ کے ہر سانس میں محبت کی مہک اور الفاظ میں اخلاق کی خوشبو بسی ہونی چاہئیں۔ ہمارے نزدیک امام صاحب مذکور فتوے لگاتے وقت بہک گئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ تلافی کر دیں مگر اب الفاظ نے ساتھ دینا چھوڑ دیا تھا۔ وہ سنبھلنے اور ڈگمگا کے دو پاٹوں میں پھنس کر کچھ کہنے کے قابل بھی نہیں رہے تاہم حواس کو مجتمع کرتے ہوئے ایک درمیانی ترکیب نکال لائے کہ:

"عرب میں سے جس نے عجم کی مشابہت کی وہ ان میں سے ہو کر کافر ہو گیا۔
اسی طرح عجم میں سے جس نے عرب سے مشابہت کی وہ مسلمان ہو گیا۔ وغیرہ۔
(صفحہ 70، 79)

تبصرہ: امام صاحب اپنے عقیدے کے مطابق داڑھی اور لباس ہی کو اسلام کا ظاہری اور بنیادی نشان قرار دیتے اور بار بار اس حقیقت کا اعادہ فرماتے ہیں کہ داڑھی اور عربی پہناوا ہی اسلام کا جز ہیں اور یہی وہ صحیح معیار ہے جو اسلام اور کفر میں حد فاصل ٹھہراتا ہے۔ اسی طرح وہ بہار کے مسلمان کو ہندو اور قلات

کے ہندو کو مسلمان تصور کرتے ہیں اور امام صاحب یہ باتیں کسی "لاعلمی" اور "بے خبری" میں نہیں فرماتے علی وجہ البصیرت اپنے عقیدے کا برملا اظہار کرتے ہیں خاص کر آپ نے اپنے ہی الفاظ میں عجمی مسلمانوں کو "**شعوبی**" منافق اور بسا اوقات عرب دوستی کے جذبے سے عاری ہونے کی وجہ سے کافر تک کہا ہے وہ عجمی مسلمان جن کی عادات و اطوار' زبان اور لباس سے مشابہت کو حرام تو یقینی — بسا اوقات کفر صریح سے بھی تعبیر کیا ہے حالاں کہ قرآن مجید میں واضح حکم ہے — **لَاتَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰی اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا**

یعنی جو مسلمانوں کی طرح تم سے دعا سلام بجالاتے ہیں انھیں غیر مسلم مت کہو۔ (نساء 93)

اس آیت میں عرب دوستی کو جزو اسلام اور لباس کے امتیاز کو خاصہ ایمان قرار نہیں دیا گیا بلکہ یہ آیت اپنے عموم میں ان مسلمانوں کو بھی اپنے اندر شامل کر لیتی ہے جو کسی وجہ سے اسلام سے بدظن ہو کر الگ راستے پر تو چل پڑے مگر سلام و کلام کی رسم کو ترک نہیں کیا۔ قرآن کہتا ہے تمھیں حق نہیں کہ ان کو دائرہ اسلام سے نکال باہر کر دو — بلکہ غیر مبہم الفاظ میں وارننگ دے دی کہ

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَ لَّاتَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ھُوَاَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی -------

تمہارا دل کسی سے اتنا میلا نہ ہو کہ تم ان کے حصے کا انصاف ہی نہ دو۔ تمہیں تو حکم ہے کہ عدل کو وطیرہ بناؤ اور تقویٰ کے تقاضے پورے کرو (مائدہ — 8)

ادھر کتب احادیث میں ارشادات نبوی کے ایسے بھی روشن اور خالص ہدایت کے نمونے ملتے ہیں جنہیں بجا طور پر قول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام دیا جا سکتا ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

من صلی صلاتنا واکل ذبیحتنا فذالک المسلم الذی لہ ذمۃ

الله و ذمة رسوله

یعنی جس نے ہماری طرح صلوٰۃ قائم کی اور ہمارا ذبیحہ کھایا تو وہ مسلمان ہے جس کی جان و مال کا ذمہ اللہ اور اس کے رسول پر عائد ہے۔ (بخاری کتاب الصلواۃ' باب استقبال القبلہ)

اس سے اگلی حدیث میں ہے کہ: **فحسابه على الله**

اس کے اعمال جیسے بھی ہوں محاسبہ کا حق صرف اللہ سبحانہ کو ہے۔ (بخاری — حوالہ مذکور)

اس نے غیرعربی وضع و قطع اختیار کی یا عرب سے دل میلا رکھا— کلمہ توحید کے حصار میں آنے کے بعد وہ مسلمان ہی ہے اور مسلمان ہی رہے گا۔ کوئی مفتی **من تشبه** کی تلوار چلا کر اسلام سے اسکا رشتہ منقطع نہیں کر سکتا۔

یہ تھے وہ عوامل اور محرکات جن کو لے کر امام ابن تیمیہ سامنے آئے اور **تشابه بالعجم** بلکہ خود عربی اہل کتاب سے مشابہت کو قطعی حرام یا— کفر کہہ کر جولانئ قلم دکھاتے رہے اور امید رکھنی چاہئے کہ ان کے روایاتی مواد کا مضمون کے آخر میں فنی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

مشابہت اسلام کے آفاقی تناظر میں: حدیث **من تشبه بقوم فهو منهم** اسنادی حیثیت سے وضعی ہے تاہم بحث کی خاطر اسے تسلیم کرتے اور خود اسلام کے آفاقی تصور کے تناظر میں اس کے مضمون کو زیر بحث لاتے ہیں۔

سید سلیمان ندوی اسلام اور ادیان کی ہم آہنگی کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

"توحید و انبیاء' عالم غیب' احکام الٰہی'— آغاز عالم سے ان کے حقائق یکساں رہیں گے۔ اسی طرح معاملات کی صداقت اور اخلاق کی طہارت کا معیار ہمیشہ سے ایک ہے اور ایک ہی رہے گا۔ قتل ناحق' دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر تصرف میں لانا' جن کے انواع' چوری' ڈاکہ زنی' غصب' خیانت اور نفرت ہیں' ہمیشہ ممنوع رہے ہیں۔ اور رہیں گے' جھوٹ کا برا اور سچ کا اچھا

ہوتا نہ کبھی بدلا ہے اور نہ کبھی بدلے گا۔ (مقدمہ اسلامی نظریہ سیاست)۔
یہ ہے دین فطرت یہ ازل سے ایک ہے اور ایک ہی چلا جائے گا۔ زندگی بھی ہمیشہ سے ایک ہے اور ایک ہی رہے گی۔۔۔۔۔ مگر اس کے مظاہرہ حالات و لوازم ایک نہیں رہ سکتے۔ علمائے نفس نے اپنے تجربات سے ثابت کیا ہے کہ ایک چیز جو کبھی اعتراض کا مورد تھی دوسرے وقت میں مستحسن سمجھی جانے لگتی ہے۔ اور جو کبھی مستحسن تھی وہ دوسرے وقت میں قابل اعتراض بن جاتی ہے یعنی مبادیات' اصولوں اور اقدار سے ہٹ کر جس طرح ہر چیز میں تغیر فطرت انسانی کا لازمہ ہے اسی طرح اشیاء کے حسن و قبح کے نئے معیارات معین کرنا بھی حضرت انسان ہی کا کام ہے۔ اسے وہی لوگ نہیں مانیں گے جو پرانی ڈگر سے ہٹنے کو خالص کفر سمجھتے ہیں۔ زمانہ بدل جائے وہ بدلنے کو آمادہ نہیں۔ ان کے نزدیک جمود کے معنی ایمان ـــــ اور حرکت کے معنی الحاد اور معقولیت کا نام ارتداد بن جاتا ہے۔ گرمیاں ختم ہو کر سردیاں آجائیں پالا پڑے پانی منجمد ہو جائے مگر وہ گرمیوں والا کرتا چھوڑنے کا نام نہیں لیتے برابر ٹھٹھرتے رہیں گے' ڈبل نمونیہ ہو جانے دو مگر خود پسند وضع نہیں بدلیں گے۔ کیوں کہ معاذ اللہ رسول اللہ کا اتباع اسی میں ہے۔ پھر بد قسمتی سے اس وقت اسلام کی زمام کار بھی انہی حضرات کے ہاتھ میں ہے وہ اسلام اسے ہی تسلیم کریں گے جو ان کے بنیاد پرست اسلاف نے پیش کر رکھا ہے ـــــ ان کے نزدیک زمانے کو کئی سو سال پہلے کے سادہ ماحول میں لے جانا ہی اسلامی نظام کو نافذ کرنے کا وحد ذریعہ ہے جو کہ قریب قریب محال ہے۔ خاص کر عقل کا ارتقائی مزاج کب گوارا کرے گا کہ ہر نیا بچہ جب دنیا میں آتا ہے' نئی ارتقائی عقل ساتھ لاتا ہے' اسے مسترد کر دیا جائے تاہم اکابرین دین و مذہب سے سوال ہے کہ کیا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی خود ایجاد مزعومات اور دین میں طبع زاد "تشددات" کے ذمہ دار ہیں؟ آپ نے واقعی جتنی سوچ سے کہ علماء نفس نے کام لیا ہے اتنا بھی نہ سوچ کر معاذ اللہ اپنی امت کے سامنے اسلام اور کفر کا معیار "لباس" ہی کو ٹھہرایا تھا ـــــ؟ ہمارے

خیال میں ان دو حدیثوں کو چھوڑ کر ان جیسی دس بیس اور احادیث مل کر بھی ایسی گواہی دے دیں تو بھی انکے کذب و افتراء ہونے میں کوئی شک نہ ہونا چاہیے—

رسولؐ اللہ نے قومی لباس دِیا ہی نہیں:

"**من تشبه**" کا ایمان سوز عقیدہ اس وقت ہی رکھا جا سکتا تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی اسلامی و قومی لباس تجویز فرمایا ہوتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ صہیبؓ بن سنان (656م) روم سے— بلالؓ (641م)— ایتھوپیا سے اور سلمان فارسیؓ (655م) اصفہان سے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر دولت ایمان سے مالا مال ہو جاتے ہیں مگر احادیث کے اتنے طویل و عریض لٹریچر میں ایک بھی ایسی حدیث نہیں ملتی جس سے اشارتاً و کنایتاً یہ ثابت ہوتا ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات کو لباس تبدیل کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ قطع نظر اس کے کہ آپ نے کوئی لباس تجویز بھی کیا تھا۔ جس سے ہمارے ایمان میں اضافہ اور یقین میں پختگی آجاتی ہے اور ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے وسیع المشرب' وسیع الظرف اور نفسیات بشر سے واقف کار معلم بخوبی جانتے تھے کہ لباس اور چہرے کی وضع و قطع کا تعلق قوموں کی تہذیب' مقامی ثقافت اور تمدن ہی سے رہا ہے اور تہذیبوں کا دھارا ہمیشہ ایک رخ نہیں بہا کرتا لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کمزور اور نو خیز امت کی گردن میں پھر سے ان طوق و سلاسل کا بوجھ نہیں ڈالا' جن کو ہمیشہ کے لئے اتار پھینکنے تشریف لائے تھے اور جن خود عائد کردہ ظواہر و رسومات نے یہودیوں کو اصل دین ہی سے منحرف کر دیا تھا۔ آپؐ اپنی امت کے لئے ایسی لعنتیں کیوں کر گوارا فرما سکتے تھے؟ آپؐ کا تو ارشاد ہے کہ:

ایاکم و الغلو فی الدین فانما ھلک من کان قبلکم الغلو فی الدین

"تم دین میں غلو کے کلچر کو داخل نہ کرنا کہ تم سے پہلے کے لوگوں نے یہ حرکت کر کے اپنا دینی وجود ہی کھو دیا۔" (احمد' ابن ماجہ' نسائی)

ائمہ حدیث اس روایت کی شرح میں لکھتے ہیں کہ:

غلو کا لفظ عام ہے۔ جو عبادات' اعتقادات' احکام اور ظاہری اعمال کی تمام اقسام کو شامل ہے اور حدیث ہذا کی رو سے مذموم اور قابل نفرت ہے۔

بین الاقوامی دور کے تقاضے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ واضح تھا کہ اسلام پر بھی ایک بین الاقوامی دور آئے گا اور اسے بھی ایک انٹرنیشنل روٹ سے گزرنا پڑے گا اور جب دنیا سمٹ کر ایک کنبہ کی مانند ہو جائے گی۔ **واذالنفوس زوجت** — قریب آتی ہوئی تہذیب' تمدن اور نئی ابھرتی ہوئی ثقافتیں جداگانہ قومی کلچروں کو پیس کر رکھ دیں گے' اس وقت "مشابہت" کو اسلام اور کفر میں حد فاصل قرار دینا — اسلام کی روح' سپرٹ اور بعثت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم (اعراف 156) کے مقصد عظمیٰ کے نہ صرف خلاف ہو گا بلکہ اشاعت اسلام کی راہ میں سد راہ بن کر ناقابل تلافی نقصان کا باعث بھی بن جائے گا۔ اس نقصان سے بچنے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر کے آخری حصے میں شام کے کیتھولک پادریوں کا لباس زیب تن فرما کر اپنی امت کے سامنے ایک نمونہ اور "**اسوہ**" رکھ دیا کہ وضع و قطع کو اصل ایمان اور روح اسلام سے نہ کوئی نسبت ہے اور نہ کوئی تعلق — بلکہ آپ نے عمر کے آخری "عقدے" میں ایک خطبہ میں زور دے کر فرمایا

ان اللہ تعالی لا ینظرالی صورکم واموالکم ولکن ینظرالی قلوبکم واعمالکم

"اللہ سبحانہ تمہاری صورتوں اور چہرے کی وضع و قطع اور لباس کو نہیں دیکھتا اس کی نظر تمہارے دل (مرکز ایمان) کے خلوص اور عمل کی سچائی پر ہے۔" (مسلم

و ابن ماجہ)

اللہ اللہ ایسے رحیم و کریم نبی الاسلام علیہ السلام پر یہ افتراء اور تہمت کی یہ جسارت کہ آپ چھوٹی چھوٹی باتوں پر مسلمانوں کو نہ صرف اپنی برادری بلکہ ادنیٰ امتی ہونے سے بھی نکال دیتے تھے— کتنا ظلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں کتنی گستاخی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ عقل سلیم باور نہیں کرتی کہ اس وضعی حدیث کا تعلق کسی لباس کے تشبہ سے ہے!

رسول اللہ ﷺ کا پہناوا نظریہ مشابہت کی نفی کرتا ہے

ہم پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ حدیث "**من تشبہ**" کا تعلق لباس سے نہیں ہے اور اگر ہوتا تب بھی آپ ﷺ نے کیتھولک چرچ کے تابع لوگوں کا لباس استعمال فرما کر اس خود ایجاد حدیث کا بھرم کھول دیا تھا— امام بخاری نے حضرت مغیرہؓ بن شعبہ (مسلم 627م، متوفی 666م) سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شامی جبہ زیب تن کئے رہتے تھے۔"

یہ شامی جبہ کیا تھا اس کی تفصیل ابھی عرض کروں گا۔ ہاں تو امام بخاری نے تین مختلف مناسبتوں سے تین مختلف عنوان دے کر اس روایت کو بیان کیا ہے یا یوں کہئے کہ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی تین حالتیں قرار دی ہیں— عبادت — جہاد — اور عام زندگی۔ چنانچہ **کتاب الصلوۃ** میں اس حدیث کو ذکر کر کے یہ اخذ کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عبادت میں بھی کیتھولک لباس استعمال فرماتے تھے— **کتاب الجہاد** میں ذکر کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ میدان جنگ میں بھی آپ کا لباس یہی رومی لباس ہی ہوتا تھا۔ اسی طرح **کتاب اللباس** میں لا کر یہ واضح کر دیا کہ۔ عام حالات میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہناوا، کیتھولک شامیوں والا پہناوا ہی ہوتا تھا— حسن اتفاق ملاحظہ ہو کہ اس حدیث کے راوی حضرت مغیرہؓ بن شعبہ صحابی ہیں جو کہ

وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی پانچ سال پہلے (627م) مسلمان ہوئے تھے —— جس کے معنی یہ ہوئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندگی کے آخری لمحوں تک اسی لباس کو استعمال فرماتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام کرمانی (1384 م) اور تیمی (   ) حدیث ہذا کے ذریعہ "من تشبہ" والی روایت کو منسوخ بتلاتے تھے۔

کیتھولک فرماں رواؤں کا مسکن

رسول اللہ ﷺ دنیا کو ایسے نظام سے متعارف کرانا چاہتے تھے جو انسان دوستی کا مثالی نمونہ تھا۔ جس میں زبان اور قومیت کا پہچان کی حد تک تو اعتراف ضرور تھا مگر اس میں ایک انسان کو دوسرے پر نہ برتری کی گنجائش تھی نہ کہتری کی صورت اور نہ ہی اونچ نیچ کا اہتمام تھا' نہ نسلی تعصب کی گنجائش نہ عنصری برتری کے اسباب! یہی وجہ ہے کہ مستقل اقدار' مبادیات اور اصولوں کا پاس کرتے ہوئے آپ ؐ نے ہر چیز میں رحمت و رافت' ملاپ اور مساوات کا راستہ دکھلایا۔ ادھر قرآن پاک نے بھی اشارہ دیدیا تھا کہ اگر اپنی کافر قوم سے کھانے پینے اور معاشرتی روابط ضروری ہیں تو جو اہل کتاب ہیں' ان سے زیادہ میل جول' کھانے پینے اور دیگر ہمہ روابط کو کام میں لائیں خاص کر یہ اہل کتاب پڑوس میں تھے عرب تجارت کی غرض سے ہمیشہ دمشق اور سیریا جاتے رہتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ خود بھی بغرض تجارت شام کو آتے جاتے تھے لوگوں سے کاروباری روابط تھے' اعتماد کی فراوانی تھی اپنے والد عبداللہ کی وفات کے بعد دادا عبدالمطلب کی نگرانی میں تایا زبیر سے مل کر تجارت فرماتے تھے —— اسی طرح جب بائیس سال کے ہو گئے تو تایا فوت ہو گئے۔ اب آپ ﷺ کے سر پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہو گئی کہ اپنا کاروبار الگ کرنے کی بجائے شراکت سے تایا کا کاروبار بھی چلائیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

یہ شام نبی اکرم ﷺ کے عہد مبارک تک اسلامی عملداری میں شامل نہیں

ہوا تھا۔ اسے مسلمانوں نے تقریباً (637 م) میں فتح کیا اور اس سے قبل (منقسم روما کے مشرقی حصے) کانسٹنٹائن چرچ کے تابع رومی حکام کے زیر اثر تھا۔ رومن ایمپائر جو کہ صدیوں کے اضمحلال کے بعد — 395م - میں بالاخر دو حصوں میں تقسیم ہو کر مشرقی یورپ (قسطنطنیہ) اور مغربی یورپ (روما) کے نام سے دو الگ الگ مراکز سے متعارف ہو چلا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تریسٹھ سالہ عہد مبارک میں جن رومی فرماں رواؤں نے شام پر حکومت کی انکے نام یہ تھے۔

I۔ گسٹینان دوم (565 تا 574 م)۔ II۔ طبریوس دوم (574 تا 756 م)۔ III۔ موریس (576 م تا 583 م) اسی کے عہد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تولد ہوئے)۔ IV۔ فوکس (582 م تا 610 م) V۔ ہرکولیس اول (610 م تا 641 م) اسی ہرکولیس (ہرقل روم) کو آپ ؐ نے وہ مشہور خط لکھا تھا جسے اسلامی دستاویزات کے ضمن میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے— کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ سب کے سب کیتھولک چرچ کے نمائندے تھے جس کا مرکز قسطنطنیہ بھی تھا اور اسکندریہ بھی— ان کے مذہبی رہنماء اور اعیان دولت فل ڈریس کے اوپر ایک لمبا مگر— (اس وقت) تنگ بازو والا (کوٹ نما) **جبہ** پہنتے تھے جسے آج (سلائی کی ترمیم سے قطع نظر) ہمارے ازہر کے شیوخ یا پاکستان میں مشنری پادری پہن کر (کتابیں تقسیم کرنے) بازاروں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ نیز حرمین الشریفین میں کلید برادران کعبہ و روضۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خواجہ سرا بھی یونیفارم کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جبہ کو مذہبی امور سے وابستہ حضرات ہی زیادہ پہنتے رہے ہیں اور یہی وہ جبہ تھا جسے سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم عبادت اور میدان جنگ سے لے کر عام حالات میں بھی استعمال فرماتے رہے۔

غیر مشروط لباس کی اجازت

علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ:

ان الجبّہ کانت شامیۃ و کانت الشام اذ۔۔ ذالک دارکفر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن دنوں یہ جبہ زیب تن فرمایا تھا' ان دنوں شام اسلامی عملداری میں شامل نہیں تھا' غیر مسلم ریاست کا حصہ تھا

(ابن حجر — فتح الباری شرح بخاری' طبع بولاق جلد 2/400/1

ابن حجر نے اپنی تائید میں بھی یہی الفاظ نقل کئے ہیں (ملاحظہ ہو فتح الباری' جلد 6/266/1 تا 7)

امام مالک' امام احمد اور ابوداؤد نے حضرت عباد بن زیاد کے ذریعہ عروہ بن مغیرہ سے بیان کیا ہے کہ رومی کرتا زیب تن کرنے کا واقعہ — غزوہ تبوک (9ھ) کے موقعہ پر پیش آیا تھا یعنی نزول احکام کے آخری سالوں میں (فتح الباری جلد 14/265/1 تا 15)

اس پہناوے کو پسند فرما کر زیب تن فرمانے کے واقعہ کو ساٹھ صحابہ کرام نے ذکر کیا ہے۔ اس طرح یہ حدیث متواتر کا درجہ حاصل کرنے کا اعزاز بھی رکھتی ہے۔ **رواہ ستون رجلا** ۔

اسے ساٹھ صحابہ نے ذکر فرمایا ہے — (فتح الباری' جلد 65/1)

اور جو روایت ساٹھ صحابہ کے توسط سے مروی ہو' اسے "**من تشبہ**" جیسی کمزور یا حب عرب کی وضعی روایات کے مقابل کیسے مسترد کیا جا سکتا ہے؟

الغرض یہ شہادتیں واضح کرتی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب یا بقول ابن تیمیہ اہل شرک کے جس لباس کو استعمال کیا تھا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری مستعملات اور معمولات کی حیثیت رکھتا اور کسی طرح کے نسخ کا متحمل نہیں ہو سکتا اور ان ہی شہادتوں اور دلائل کو سامنے رکھ کر علامہ تیمی اور بخاری کے سب سے قدیم شارح — امام محمد بن یوسف شمس الدین کرمانی (1384م۔ 786ھ) نے پوری صراحت سے لکھا کہ

فيه اباحة لبس ثياب المشركين لان الشام كانت فی ذالک الوقت دارکفر وکان ذالک فی غزوة تبوک سنة تسع وکانت ثیابهم ضیقة الاکمام

"یہ حدیث جو تواتر کا درجہ رکھتی ہے اور واضح کرتی ہے کہ اہل شرک کا لباس علی الاطلاق مباح' جائز اور روا ہے کیوں کہ یہ واقعہ حیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری لمحات سنہ 9 ہجری کا ہے۔"

(الکوکب الداری شرح بخاری--- طبع۔ المطبعته المصریه— 1932م (طبع اول جلد 22/4 عنوان کتاب الصلواة فی الجبته الشامیه)

یہ اقتباس واضح کرتا ہے کہ محدثین ثقات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال اور کردار سے غیر مسلموں کے لباس کے استعمال کو علی الاطلاق جواز اور رخصت کا قرینہ ٹھہرا کر— **من تشبه** — کے ابن تیمیہ والے مفہوم کو مسترد کرتے تھے۔ تو کیا اب بھی شک ہے کہ **من تشبه** کا تیموی مفہوم ناقابل قبول اور ناکارہ ہے اور ابن تیمیہ کا فتویٰ غلط ہے کہ ایسے لوگ کافر ہیں (صفحہ 3/65 تا 4)

قومی لباس

امام ابن تیمیہ ہٹ کے پکے تھے۔ جو بات کہتے اس پر ڈٹ جانے والے تھے چنانچہ آپ نے عربی لباس کے اسلامی لباس ہونے پر جو دلائل فراہم کئے تھے' وہ مزید کوشش میں رہے کہ کہیں سے قومی لباس کا سراغ لگا کر اپنے پوچ استدلال کو سہارا فراہم کریں چنانچہ آپ نے بہ تکلف کہیں سے اس کا سراغ لگا ہی لیا۔ فرماتے ہیں۔

ان عمرؓ "امر" بالمعدية وهی زی بنی عدنان وهم العرب فالمعدية نسبة الی معد'— ونهٰی عن زی العجم وزی

المشركين وهذا كما لا يخفٰی وقد تقدم هذا مرفوعًا۔

ابو عثمان روایت کرتا ہے کہ ہم آذر بائیجان کے علاقے میں تھے کہ حضرت عمر بن الخطاب کا ایک طویل مکتوب صادر ہوا۔ جس میں منجملہ دیگر ہدایت کے ہائی کمان نے یہ حکم بھی صادر فرمایا تھا کہ ہم "**معد**" قبیلہ کا لباس استعمال کریں اور عجمیوں (مسلمانوں خواہ) مشرکوں کے لباس سے روک دیا۔" (ص 61 سطر 2 تا 4 بحوالہ مسند احمد)

ابن تیمیہ ـــ مانیں نہ مانیں' اس روایت سے تو الٹا یہ ثابت ہوتا ہے کہ قومی لباس نہ تو نبی اکرم ﷺ نے خود تجویز فرمایا اور نہ ہی خلیفہ راشد ابوبکر صدیقؓ نے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لباس کا مسئلہ دینی مسئلہ نہیں تھا خاص کر دین مکمل ہو چکا تھا۔ ایسے میں روایت کا اتنا سا ٹکڑا ہی ایک ایسے سیاق کا پتا دے رہا ہے جو کسی طرح بھی ہمارے موقف کی نفی نہیں کرتا کیوں کہ حضرت ابن الخطاب نے فتوحات کے سلسلہ میں جو فوجیں بھیجی تھیں ان کو کفار و مخالفین کی افواج سے ممتاز رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ ازروئے سیاست کسی بھی عربی قبیلہ کے لباس کو یونیفارم کے طور پر (ایام جنگ میں) استعمال کرنے کا ہنگامی حکم صادر فرمادیں۔ اور یہ حکم ازروئے سیاست اس لئے بھی ضروری تھا کہ ـــ آذر بائیجان میں اگر میدان کارزار گرم ہو اور لاشوں کا شہر آباد ہو تو الگ کرتے وقت کوئی التباس اور اشتباہ نہ رہے' اس طرح یہ ایک قومی ضرورت تھی اور قومی تقاضوں کو مگر ہنگامی طور پر ملحوظ رکھ کر پورا کیا گیا۔ اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے مشرکین شام سے تبوک میں لڑتے ہوئے بھی کسی عسکری ضرورت کے مدنظر کوئی سا الگ لباس تجویز نہیں فرمایا۔ مخالفین کے لباس کو پہن کر ہی میدان وغا میں اترے۔ بہرحال عارضی فرامین کی مستقل حیثیت نہیں ہوتی۔ ابن تیمیہ اپنی سوچ کا زاویہ درست کریں۔ کسی کی ذاتی خواہشیں دین نہیں بن جاتیں۔

فصل دوم

تمدنی اور معاشرتی امور میں رسول ؐ اللہ کی پالیسی:

رسول ﷺ صرف دین کے معاملات ہی میں غیروں سے ہم آہنگی میں احتیاط برتتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ نے تمدنی خواہ معاشرتی عادات میں کسی سے کوئی امتیاز نہیں برتا۔

حضرت امام بخاری (متوفی 870م) اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ:

كان النبى صلى الله عليه وسلم يحبّ موافقة اهل الكتاب فيمالم يومربہ وكان اهل الكتاب يسدلون شعارهم وكان المشركون يفرقون روسهم فسدل النبى صلى الله عليه وسلم ثم فرق بعد

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر اس بات میں جس کے متعلق وحیؑ کی تعلیم نہ ملی ہوتی تمدنی خواہ معاشرتی عادات و خصائل میں یہود و نصاریٰ سے ہم آہنگی پسند فرماتے تھے۔ مثلاً" اہل کتاب بالوں کی مانگ نکالے بغیر سیدھی کنگھی دے دیتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا ہی کرتے رہے اور مشرکین مانگ نکال لیا کرتے تھے۔۔۔ بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بھی اختیار فرمایا۔
(بخاری بمع شرح فتح الباری طبع امیریہ 1301 ھ۔ مصر جلد 304/10، 305 کتاب اللباس باب الفرق)

یہ حدیث اپنے مفہوم میں اس قدر واضح اور مطلوب میں اس قدر روشن ہے جسے کسی تفسیر و تعبیر کی کثافت سے بے نور بنانا نہ صرف یہ کہ اس کی روح کو فنا کر دے گا۔۔۔ تمدنی و معاشرتی مسائل میں ہمارے سامنے اسوۃ النبیؐ کی کوئی بھی زندہ مثال باقی نہیں رہے گی۔۔۔ ویسے بھی زندگی کے طولانی سفر میں اپنوں اور پرائیوں کی رہن سہن کی بعض عادات اور تمدنی و معاشرتی بعض امور میں ہم

آہنگی پیدا کرنا نہ تو معیوب ہے اور نہ ہی رسالت کے نقطہ نظر سے قابل گرفت۔

یہ حدیث جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کی سچی تصویر پیش کرتی ہے اس میں "**یحب**" کے لفظ سے پہلے "**کان**" کا حرف ہے جو کہ استمرار اور دوام کا فائدہ دیتا ہے۔ یعنی آنحضرتؐ کی دائمی عادت ہی یہی رہی ہے کہ آپؐ غیر مامور باتوں میں اہل کتاب کی موافقت کرنا محبوب سمجھتے تھے۔ اس روایت کے آخری راوی حضرت عبداللہ بن عباس (258 م) ہیں جو کہ وفات نبوی (642 م) کے وقت یہی کوئی گیارہ بارہ سال کی عمر کے تھے—— اس طرح ان کا مشاہدہ بھی گواہی دیتا ہے کہ آنحضرتؐ زندگی کے آخری لمحوں تک غیر مسلموں کے سماجی' معاشرتی اور مجلسی امور میں دلچسپی لیتے تھے' اندریں حالات اس حدیث کو منسوخ قرار دے دینا نہ صرف یہ کہ امر واقعہ اور حقیقت ثابتہ کا منہ چڑانا ہے بلکہ خود اپنی جہالت اور نادانی کا پتہ بھی دینا ہے۔ یہی حدیث امام مالک اور مصنف عبدالرزاق میں مزید وضاحت سے آئی ہے کہ

"**کان اذا شک فی امر لم یؤمر فیه بشئی صنع مایصنع اهل الکتاب**"

"سید البشر جب کوئی کام کرنا چاہتے اور وہاں درست' غلط ہونے کا شک گزرتا (کہ غیر منصوصہ امور میں ایسے شک کا پیدا ہونا فطری بات ہے' طارق) تو اس وقت آپ وہی کچھ کر گزرتے جو کہ اہل کتاب کے معمولات میں سے ہوتا۔" (فتح الباری—— حوالہ مذکور)

پریشان کن حدیث

مثل مشہور ہے کہ —— مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید—— اسی طرح حدیث نبویؐ جب آپؐ کے مشن اور قرآنی تعلیمات کے مطابق ہو گی تو ہر

سلیم الذہن انسان کے دل میں گھر کر جائے گی اور اس کی نورانیت سے **مستنیز** اور ہدایت سے کائنات مستفید ہو سکے گی۔ اس موافقت اہل کتاب والی حدیث ہی کو لے لیجئے اور اس کی معنویت پر غور فرمائیے تو کھل جائے گا کہ اہل کتاب سے شادی بیاہ اور ان کا کھانا کھانے کی قرآنی اجازت میں بھی ایک گونہ ان سے "مشابہت" اور موافقت کا رجحان عیاں ہے۔ بایں ہمہ بعض شارحین احادیث ایسی ذہنیت کے مالک تھے جو قرآن حدیث کے واضح احکامات کی موجودگی میں اہل کتاب کی مخالفت کو لازمی گردانتے تھے۔۔۔ چنانچہ اس پریشان کن حدیث سے یہ لوگ اس قدر سراسیمہ ہو گئے۔۔۔ گھبراہٹ اور بدحواسی کا ان پر ایسا عالم طاری ہوا جو حد بیان سے باہر ہے یعنی موافقت اہل کتاب والی حدیث ان کی خالی اور وہمی **من تشبہ** والی عمارت کو دھڑام سے گرانے کے لئے ڈائنامیٹ کا کام کر گئی۔۔۔ اب ان کو اور تو دفاع کی کچھ نہ سوجھی۔۔۔ لگے خود اس حدیث کے متن میں "قلب ماہیت" کرنے چنانچہ محدثوں کے وکیل اعظم' حافظ ابن حجر (1449م) فرماتے ہیں کہ:

> "**سدل**" یعنی بغیر مانگ کے کنگھی دینا اہل کتاب کا شعار تھا اور **فرق** یعنی مانگ نکال لینا بت پرستوں کا۔۔۔ بعد میں بت پرستوں نے جب اسلام قبول کر لیا تو آپؐ نے اہل کتاب کی مخالفت شروع کر کے بت پرست نو مسلموں و سابقہ بت پرستوں کی' موافقت کر دی' یعنی مانگ نکالنے لگے۔ لہٰذا حدیث کا پچھلا حصہ پہلے حصے کا ناسخ ٹھہرا۔
>
> (خلاصہ از فتح الباری جلد 305/10)

تبصرہ: حافظ مرحوم کی اس وکالت کا سلبی مفہوم یہ ہوگا کہ اگر کوئی قوم مسلمان ہونے کے بعد بھی اپنی ماضی کی عادات و رسوم پر کاربند ہے تو ایسے میں ان کی عادات اگرچہ کفر کی یادگار ہیں لیکن عاملوں کی نسبت کی وجہ سے قابل اعتراض نہیں مثلاً زنار اور قشقہ کھینچنا ہندوؤں کا شعار ہے لیکن وہ اگر مسلمان ہونے کے بعد بھی اس شعار سے دست بردار نہیں ہوئے تو اب وہی زنا اور قشقہ اسلامی

شعار ہی متصور ہوں گے۔ چلو ایسا ہی سہی۔ لیکن تعجب ہے کہ آپ بت پرستوں کی مانگ کو تو اس اصول کی بناء پر اسلامی شعار تسلیم کرتے ہیں لیکن عجمی مسلمانوں (ایرانیوں اور سندھیوں) کا لباس آپ کے نزدیک پھر بھی حرام ہے — آخر کیوں؟

دوسری بات جو ابن تیمیہ اور ابن حجر کی زبانی گردش کر رہی ہے وہ "نسخ" کی ہے جو ہمارے نزدیک محل نظر ہے۔ ادھر ہم علمی پسماندگان کا آپ حضرات سے کسی نہ کسی زاویہ سے احترام کا رشتہ قائم ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ عقیدت کے بندھن ٹوٹ جائیں لہٰذا ہر دو حضرات سے التماس ہے کہ سماجی' تمدنی اور معاشرتی مسائل میں "نسخ" جیسی نحوست کا کھوج لگانا آپ حضرات کو زیب نہیں دیتا۔ جب احکام و مسائل میں "نسخ" کا چلن کامیاب نہیں ہوتا تو سماجی مسائل میں کیوں کر ہو سکے گا؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ اللہ پر ایمان رکھنے والے مسلمان بن سوچے آپ کی خدائی کی حکمرانی تسلیم کر لیں یا پھر اسلام کی حدود سے نکل جائیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر بے دلیل ایمان سے بادلیل کفر بہتر ہے — مشہور پنجابی سرخ دانشور پروفیسر موہن سنگھ بجا کہتے ہیں۔

لائی لگ مومن دے کولوں
کھوجی — کافر — چنگا

امام ابن تیمیہ کی پہلوانی: یہ حدیث نہ معلوم کن کن شریعت مابوں کے لئے وجہ پریشانی بن گئی ہو گی کہ وہ ہر حیلہ اور بہانہ سے اسے منسوخ ثابت کرنے کیلئے پورا زور لگائے ہوئے ہیں۔ امام ابن تیمیہ بلاشبہ علم کے پہاڑ تھے مگر تشدد پسندی نے انہیں اتنا بے وزن اور "ہولا" بنا دیا تھا کہ عقل کی ایک ہی جنبش سے یہ پہاڑ لرزہ براندام ہوتا رہا۔ آپنے بھی اچھی توانائیاں حدیث "موافقت" کو منسوخ کرنے پر صرف کر دیں لیکن افسوس کہ اس مہم جوئی میں بری طرح ناکام ہو گئے۔ فرماتے ہیں کہ:

كان يحب موافقة اهل الكتاب فيمالم يؤمرفيه بشئى من وجوه احدها ان هذا كان متقدما ثم نسخ الله ذالک و شرع له مخالفۃ اہل الکتاب و امره بذالک

"موافقت اہل کتاب پر پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کار بند تھے پھر اللہ نے موافقت منسوخ کر کے مخالفت کا حکم دے دیا۔"

(اقتضاء الصراط المستقیم صفحہ 82/ 19 تا 23)

تبصرہ: ناسخ و منسوخ کا سلسلہ پہلے تو لایعنی سلسلہ ہے۔ اگر بحث کی خاطر اسے تسلیم کیا جائے تو بھی کیتھولک چرچ والوں کا لباس آپ ؐ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں پہنا اور تازیست ایسے ہی لباس میں رہے۔ ایسے میں ابن تیمیہ کا فرمان کہ موافقت والا عمل زمانہ ماضی سے تعلق رکھتا ہے بعد میں اللہ سبحانہ نے اسے منسوخ کر کے مخالفت کا حکم دے دیا تھا' جہالت کا پلندہ بن جاتا ہے بلکہ نسخ کو اللہ کی طرف نسبت دینے سے جھوٹ اور اللہ پر افتراء بھی بن جاتا ہے۔ اللہ نے کس آیت اور کس رکوع اور پارہ میں نسخ کا حکم دیا ہے۔ خاص کر نسخ اس وقت ہی بحث میں لایا جا سکتا ہے جب موافقت کا حکم قرآن میں ہوتا اور پھر قرآن ہی نسخ کا حکم دے کر سابقہ عمل سے روک دیتا۔ جبکہ یہاں ایسی کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔ رسول ؐ نے اپنی پسند اور وجدان کو حکم بنایا اور اسی کی ضو میں جس عمل کو چاہا اپنا لیا اور جس کو نہ چاہا' زیر عمل نہیں لائے۔۔۔۔۔

امریکی اہل قلم مارک ٹوئن۔۔۔۔ کہتا ہے کہ ۔۔۔ اگر مردے بات کر سکتے تو تاریخ کا تمام ذخیرہ جھوٹ کا پلندہ بن جاتا۔۔۔۔ اب ہم ایسا تو نہیں کہتے لیکن اگر ہمارے آقاو مولا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کر کے ضروری باتوں کی تصدیق ممکن ہو جاتی تو کم از کم ابن تیمیہ کی **اقتضاء الصراط** کی 98 فیصد حدیثیں اور ساڑھے ننانوے فیصد تشریحات یقیناً بے کار ہو جاتیں۔ ادھر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ انہیں قرآن پاک کی ذیل کی آیت

کے خصوص کا بخوبی علم ہو گا۔ ایسے میں ان کی پہلوانی قابل داد بن جاتی ہے۔
ارشاد ہے **اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ**

> اے نبی محتشم صلی اللہ علیک و سلم۔ یہ وہ لوگ ہیں جو آپ ؐ سے پہلے ہدایت پا چکے تھے اور تمہیں حکم ہے کہ سیرت اور معاشرتی امور میں ان کے طریق کار کو اپنا لیں (انعام' 90)

اور ظاہر ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو توحید' رسالت' اصولوں اور مبادیات کے باب میں نہیں کہا جا رہا کہ اپنا منصب چھوڑ کر ان باتوں میں بھی اہل کتاب کا طریق کار اپنائیں۔یہاں یقیناً سماجی' معاشرتی' تمدنی امور میں یکسانیت اور ہم آہنگی کا حکم ہے۔ ادھر — انعام — مدنی سورتوں میں سے ہے جس کا ملاؤں کے معیار کے مطابق بھی نسخ کا امکان باقی نہیں رہتا' کہ موافقت اگر مطلوب ہے تو بھی صرف معاشرتی امور میں ہے۔ نبوت کے منصبی امور میں رسول ﷺ کسی کو بھی ساجھی اور ہم آہنگ نہیں بنا سکتا۔ ابن تیمیہ بہت دور چلے گئے اور غیر ضروری باتوں میں الجھ گئے اور الجھا دیا۔

ابن تیمیہ بپھر گئے : موافقت اہل کتاب والی حدیث اپنے اندر ایک واضح مفہوم رکھتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم اپنے وجدان اور خدا داد بصیرت ہی سے کسی قوم کی موافقت کرتے تھے اور اسے تا وقتے نہیں چھوڑتے تھے جب تک وحی صریح ممانعت کا امر لے کر نہ آتی۔ اور پھر اس کا بھی ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں کہ کون سی بات صیغہ "نہی" میں لے کر وحی آئی اور آپ ﷺ نے اسے چھوڑ دیا۔ اور اس طرح کا ریکارڈ نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ موافقت غیر دینی امور ہی میں مطلوب تھی اور انعام (90) میں ایسے ہی غیر دینی امور میں موافقت مطلوب تھی۔

اتنی وضاحتوں کے باوجود ابن تیمیہ ہر وقت ناراض رہتے اور کسی نہ کسی بہانے اپنے غصے کا اظہار کرتے ہی رہتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ

ولوقال رجل يستحب لنا موافقة اهل الكتاب الموجودين فی زماننا لكان قدخرج عن دين الامه

"جس نے زمانہ حال کے اہل کتاب سے موافقت کو امر محبوب میں شمار کیا' وہ دین اسلام سے قطعی خارج ہو گیا۔ (ص 84/ 7 تا 8)

تبصرہ: ہمارے خیال میں ابن تیمیہ اور ابن حجر نے کمال انتہا پسندی سے کام لے کر اپنی علمی استعداد کو دھبا لگا دیا ہے — یہ حدیث بالکل بے عیب ہے تاہم اس کا ایک لفظ "**ثم فرق بعد**" فنی تحلیل کا متقاضی ہے جو چند لمحوں کے بعد معلوم ہو گا۔ ویسے اس کے متعلق امام احمد بن عمر بن ابراہیم الانصاری القرطبی (1258 م) کا تبصرہ جسے ابن حجر نے بربنائے تعصب مسترد کر دیا ہے وہی زیادہ دقیع اور اصابت کے لحاظ سے نہایت بلند ہے۔ فرماتے ہیں

"اہل کتاب کی مخالفت ہو یا موافقت یہ وقتی مصلحتوں سے تعلق رکھتا ہے اور وقتی مصالح کے لئے ضروری نہیں کہ شرعی اسباب و علل کا سہارا لیا جاتا' اگر اہل کتاب کا قومی نشان "**سدل**" منسوخ ہوتا تو اس پر سب سے پہلے تمام صحابہ یا کم از کم اکثر تو ضرور ہی عمل کرتے یعنی **سدل** (سیدھی کنگھی) روک کر عملاً اہل کتاب کی مخالفت شروع کر دیتے' لیکن ہوتا یہ رہا اور روایات سے بھی یہی پایا جاتا ہے کہ صحابہ کرام مانگ بھی نکال لیا کرتے اور بالوں کو الٹا کر سیدھی کنگھی بھی پھیر دیا کرتے تھے' رضی اللہ عنہم — اسی طرح صحیح احادیث میں منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بال مبارک گھنے ہوتے تھے اور ایسے میں اگر تو وہ قابل تفریق ہوتے تو مانگ نکال لیا کرتے اور اگر نہ ہوتے تو — سدل — کی صورت میں بغیر مانگ لینے کے ہی سنوار لیتے تھے۔"

(بحوالہ فتح الباری جلد دہم صفحہ 305)

امام قرطبی کے اس فاضلانہ اور منصفانہ تبصرہ کے بعد ضرورت نہیں تھی — کہ موافقت اہل کتاب کی حدیث کو چھیڑا جاتا لیکن اہل تعصب نے یہاں بھی

اپنی روش نہیں بدلی اور کہہ دیا کہ اس کے بعد والے حرف (فرق) نے اس کے پہلے حرف (سدل) کو منسوخ کر دیا حالانکہ کسی خصلت و عادت کے بارے میں جو نہ دین ہے نہ دین سے متعلق ہے' اس کے پہلے حصے کو بعد کے حصے سے منسوخ کرنا مکروہ انداز فکر ہے۔ ہمیں اندیشہ تھا کہ سطحی انداز فکر والے بخاری کی سیٹنگ سے کوئی نہ کوئی کج بحثی کا شوشہ چھوڑیں گے اور سارا زور اس بات پر ہو گا کہ رسول اللہ ﷺ نے چونکہ مانگ نکالنا شروع کر دیا تھا لہٰذا سیدھی کنگھی دینا منسوخ ہے۔ مانا کہ "**ثم فرق بعد**" نے "**سدل**" کو منسوخ کر دیا لیکن اس کے لئے کم از کم ناسخ کو یقینی ہو جانا چاہئے جب کہ یہاں "**فرق**" قطعی اور حقیقی نہیں' "پیوند" ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اس روایت کی سند کے بخاری سے چوتھے نمبر پر امام محمد بن شہاب زہری (741م) کا اسم گرامی واقع ہے۔ یہ بڑے جلیل القدر امام اور جامع حدیث بزرگ ہو گزرے ہیں۔ آپ کی خوبیاں گنتی سے باہر ہیں لیکن بایں جلالت شان آپ احادیث میں پیوند کاری کے عادی تھے جو صداقت و دیانت کے منافی ہے۔ امام موصوف اپنے فن "پیوندکاری" میں اتنے ماہر اور مشاق تھے کہ نہایت بے عیب اور جرح و قدح سے محفوظ احادیث میں اتنی صفائی سے پیوند لگاتے کہ بڑے بڑے راہواران حدیث بھونچکا رہ جاتے۔ اس سے حدیث کا آگا پیچھے سے یا پیچھا آگے سے مختلف ہو جاتا۔ حدیث تمام تر مہمل اور بے مقصد ہو کر رہ جاتی۔ آپ کی اسی خوگری ادراج و پیوندکاری سے اکثر ائمہ اعلام اور محدثین ثقات نالاں تھے اور اسے منہ پر ہی ٹوک دیتے تھے۔ سنن ترمذی کے بڑے شارح علامہ حافظ عبدالرحمان رحمۃ اللہ نے "**تحقیق الکلام**" جلد 2' طبع دوم صفحہ 31' 72' 102 تا 107 —— زہری کی ایسی ہی گندی عادات کو نمایاں کر کے سخت جرحیں نقل کی ہیں۔ اس میں امام طحاوی (922م) کی کتاب "**المعتصر**" طبع مصر صفحہ 115 کے حوالہ سے لکھا ہے کہ —— امام زہری کلام رسول معصومؑ میں اپنے کلام کی بے باکانہ آمیزش کرنے کے خوگر تھے جس پر ان کے ہم عصر موسیٰ

بن عقبہ (724م) نے انہیں شدید لہجہ میں سخت سست کہا بلکہ خود امام بخاری نے امام مالک کے حوالہ سے لکھا ہے کہ زہری کے دیگر ہم عصروں میں سے امام ربیعہ (756م یا 770م) مطابق 132 ہجری یا 146ھ) نے بھی زہری کو جھڑک کر کہا کہ اپنے کلام کو رسول معصوم کے کلام سے الگ کر کے بیان کرو

(جزء القراۃ ـــ امام بخاری صفحہ 13)

امام زہری جب اتنے گھناؤنے عیب میں ملوث اور "پیوند کاری" کا عادی تھا تو اس کے "**ثم فرق بعد**" کے پیوند کو کیوں کر قبول کیا جا سکتا ہے؟ بالخصوص جب کسی خاص موضوع کی مناسبت سے حدیث بھی ایک ہی ہو اور اس کا راوی بھی تنہا ابن شہاب ہی ہو تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا پیوند قابل اعتماد ہو لہٰذا ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ "**ثم فرق بعد**" زہری کا پیوند ہے اپنے سیاق اور سباق سے مختلف مفہوم دیتا ہے۔ بنا بریں موافقت اہل کتاب بحکم قرآن اور بارشادات احادیث صحیحہ اپنی جگہ پر ثابت اور قائم ہے۔

غیر مشروط لباس:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی خاص لباس کو نہ تو اسلامی کہا ہے اور نہ آپ کا ایسا ارادہ تھا کیوں کہ انسانی ذوق کے تنوع کی وجہ سے آپ ﷺ یک رخ پالیسی دے ہی نہ سکتے تھے آپ ﷺ نے اگر لباس کے ضمن میں کچھ فرمایا بھی ہے تو اس کا تعلق وضع قطع اور خصوصی ڈیزائن سے نہیں بلکہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے ہے۔ جس سے امیر و غریب کے لباس میں "منافست اور منافرت" کو ختم کرنے کا سامان تھا اور بس ـــ

جہاں تک ہر گونہ لباس کی اجازت کا تعلق ہے تو امام بخاری نے کتاب اللباس کا پہلا عنوان ہی قرآن مجید کی اس آیت سے باندھا ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ ـــ بے قید و بلا شرط جو لباس بھی ذوق انسانی اور مقامی روایت کو گوارہ ہو اس کا

استعمال قطعی مباح اور حلال ہے اور اللہ نے اپنے بندوں پر شفقت کرتے ہوئے اسے "**زینت**" ہی قرار دیا ہے— حرام کہنے والا کون ہوتا ہے؟" (اعراف— 31)

اس قرآنی عنوان کے بعد امام موصوف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول پیش کرتے ہیں کہ:

کلوا والشربوا والبسوا و تصدقوا— فی غیر اسراف ولا مخیلۃ

"جو مرضی آئے کھاؤ پیو اور جو چاہو پہنو— اور مستحق لوگوں کی امداد کرو— تکبر اور فضول خرچی سے بچے رہو۔" (بخاری)

اس روایت میں "**کلو اور البسوا**" کے غیر مشروط الفاظ کی مزید تشریح میں حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ:

کل ماشئت والبس ماشئت

"حرام ماکولات کو چھوڑ کر جو جی میں آئے کھاؤ پیو اور لباس میں آزاد ہو' جو پسند آئے' پہنو۔

(بخاری کتاب اللباس)

اس روایت میں "**ماشئت**" کا لفظ قابل غور ہے جو ایسے مفہوم میں استعمال ہوا ہے جس کی تخصیص نہ ہو سکتی ہو لیکن غذا کے لئے چونکہ وحی قرآن نے وضاحت کر دی تھی اور ایک واضح قانون بھی موجود تھا کہ حلال بھی ہو اور طیب بھی— طیب کے معنی ہیں خوش گوار اور ذوق سلیم پر گراں نہ گزرنے والی چیز' لہٰذا— **کل ماشئت** میں صرف حلال اور طیب غذائیں ہی شامل ہو سکتی ہیں پکی پکائی خواہ کسی کے ہاتھ ہی کی کیوں نہ ہوں!!

اور ہاں لباس کے لئے کوئی قانون تو موجود نہیں تھا البتہ فخر و مباہات سے بچنے کے لئے اخلاقی طور پر توجہ دلائی۔ اور وہ بھی زوردار الفاظ میں نہیں۔ کیوں کہ اخلاقیات میں "جبر" نہیں ہوتا۔ لہٰذا انگریزی خواہ عربی' پاکستانی خواہ روسی' چینی خواہ برمی' سندھی خواہ سنکیانگی' افریقی خواہ ایشیائی' جو لباس بھی ذوق گوارا اور

خاص محل وقوع بھی اس کا متقاضی ہو' استعمال کر سکتے ہو کیوں کہ تکبر اور غرور لباس کے علاوہ بھی ممنوع اور معیوب ہے۔ علماء کے علم اور فتوے کا پندار' زاہدوں کے نجات کا گھمنڈ کس سے پوشیدہ ہے؟ جبہ و دستار اور شملہ میں رعونت و نخوت کا جو بارود بھرا ہے' کون ہے جو نہیں جانتا۔ لیکن کسی نے بھول کر بھی انہیں توجہ دلائی ہے کہ اے وارثان علم و عبادت' یہ اکڑنا اور اترانا کس لئے؟ اللہ تو تمہاری اکڑ اور اتراہٹ سے نفرت کرتا ہے (نحل' 23)

فصل سوم

داڑھی — من تشبہ کے تناظر میں

جس طرح حدیث "**من تشبہ بقوم**" کا تعلق لباس کے کسی بھی قسم سے نہیں ہے اسی طرح داڑھی نہ رکھنے سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ محدثین نے بطور خاص اسے "داڑھی" کے ضمن میں ذکر کیا ہی نہیں — لیکن امام ابن تیمیہ کے پیروکار جہاں دیگر خود ایجاد احادیث سے مسلمانوں کی تکفیر کا اہتمام کرتے ہیں وہاں انہوں نے اس حدیث سے بات چلانے سے بھی گریز نہیں کیا —

جہاں تک میں سمجھتا ہوں اسلام ظاہری ہیئت و شکل پر زور نہیں دیتا — اس کا تمام زور باطن کی صفائی اور اخلاق حمیدہ تک ہی محدود ہے اور یہ دونوں چیزیں توحید و رسالت کے مفہوم کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینے سے ہی حاصل ہو سکتی ہیں۔ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ طبع زاد پاکیزگیوں کا لامتناہی سلسلہ پھیلا کر انسان کی حسی رغبات کو کچل دے۔ یعنی ایسی پابندیاں عائد کر دے جن پر نہ تو مسلمان

عمل کر سکیں اور نہ ہی متواتر ترک حکم کی وجہ سے دائمی کفر سے بچ بھی سکیں — کیوں کہ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ — جب کسی بات کو حرام کہا جائے تو حرام کا متواتر ارتکاب کفر بن جاتا ہے۔ اور پھر امت اسلام کی چھانٹی ہوتے ہوئے درجہ ایمان صفر کے درجہ تک گر جاتا ہے۔ اور پھر یہ بات سچ ہو جاتی ہے کہ

امت کو چھانٹ ڈالا کافر بنا بنا کے
اسلام ہے قیہو ممنوں بہت تمہارا

بلاشبہ بعض احادیث میں داڑھی کا اشارہ ملتا ہے لیکن آپ ﷺ نے یہ کہیں نہیں فرمایا کہ — داڑھی نجات — ایمان اور مسلم بننے کے لئے قطعی شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔ بلکہ آپ سے اتنا بھی ثابت نہیں کہ آپ نے اسے تبلیغ رسالت کا جزو بنا کر "سنت" کہا ہو' ایسی سنت جسے ترک کرنے پر جہنم اور عمل کرنے پر جنت کا پروانہ مل سکتا ہو بلکہ اس ضمن میں ہمارے سامنے جو احادیث پیش کی جاتی ہیں ان میں سب سے زیادہ معتبر حضرت عبداللہ بن عمرؓ (691م) کی روایت ہے جسے بخاری و مسلم نے یوں ذکر کیا ہے کہ فرمایا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے:

خالفوا المشرکین حفوا الشوارب واعفوا اللحیٰ

مشرکین کی مخالفت میں مونچھیں صاف کرو اور داڑھیاں بڑھالو۔

حدیث کے اتنے سے الفاظ سے تو یہی کچھ مترشح ہوتا ہے کہ — کسی "دینی عقیدے" کی بناء پر نہیں بلکہ ہنگامی اور سیاسی طور پر ایرانیوں سے مختلف رہنے کی تلقین فرمائی جس کی غایت یہی کچھ معلوم ہوتی ہے کہ ابتدائے اسلام میں موحد برادری مختصر تھی پھر دور دراز سے لوگ پہنچ کر آزاد انسانوں کی صفوں میں شامل ہو کر آزادی سے سانس لینے لگے پھر ایسا بھی ہوا کہ ہمسایہ ممالک نے تعصب کی راہ چل کر مسلمانوں کے کام میں رکاوٹیں کھڑی کیں اور نظریئے کی

اشاعت میں سد راہ بن گئے تو ایسے میں آپ ﷺ نے شناخت کی سہولت کے لئے دشمنوں کی مخالفت کو "علت" ٹھہرا کر معروضی طور پر ان سے ممتاز رہنے کا اشارہ دیا ہو۔ لیکن یہ بھی اس وقت ہی ہو سکتا تھا جب کفار کی مخالفت عدم تصدیق رسالت کے ماسوا داڑھی اور مونچھوں میں مخالفت کو بھی مطلوب شرع ثابت کیا جاتا۔ پھر یہ بھی طے ہونا چاہئے کہ مشرکین کی مخالفت داڑھی منڈوانے میں مطلوب ہے یا مونچھیں بڑھانے میں؟ اگر داڑھی بڑھا کر مشرکین کی مخالفت مطلوب تھی تو راویان احادیث کی تاریخ دانی کا جواب خود بخاری ہی میں موجود ہے کہ۔

جب ابو جہل (622م) کو "عفراء" کے دو بیٹوں معاذ اور معوذ نے جنگ بدر میں ٹھنڈا کر دیا تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس کی لاش پر پہنچ کر اس کی داڑھی کو زور سے جھٹکے دے کر ملامت اور تشنیع کے طور پر کچھ کلمات کہے۔

(بخاری صفحہ 16 کتاب المغازی باب قتل ابی جہل)

علاوہ ازیں ذیل کی کتابوں میں ابو جہل کی داڑھی کی تفصیل ملاحظہ ہو

- **ابن اثیر** طبع مصر جلد I/ صفحہ 23، 25، 26 تا 47
- **عیون الاخبار** جلد I صفحہ 22
- **السیرۃ الحلبیہ** طبع مصر جلد 2 / صفحہ 23
- دائرہ المعارف الاسلامیہ جلد I/ 322،
- **امتاع السماع** جلد 1/ 18

تبصرہ: اور یہ معلوم ہے کہ ابو جہل مشرک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بد ترین دشمن تھا، مگر تھا باریش—— ایسے میں داڑھی رکھنے سے مشرکین سے جو مخالفت مقصود ہوتی ہے وہ غلط ثابت ہو جاتی ہے، خاص کر ابن عمرؓ جو اس حدیث کے راوی ہیں حج اور عمرہ میں جہاں سر کے بال منڈھواتے تھے وہاں

داڑھی کا معتدبہ حصہ بھی لے لیتے تھے۔ (بدرالدین عینی' (1451م) طبع منیریہ جلد 22 / 46) — کچھ لوگوں نے ابن عمرؓ کی اس روایت میں از خود یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ وہ قبضہ سے اوپر کے بال ہی تراش لیتے تھے لیکن صد افسوس کہ امام مالک نے جو الفاظ نقل کئے ہیں ان میں یہ اضافہ نہیں ہے — ان میں ہے کہ:

اذا حلق راسه فی حج او عمرة اخذ من لحیته و شاربه

"ابن عمرؓ حج اور عمرہ کے لئے جب سر کے بال ترشواتے تو داڑھی اور مونچھ کے بالوں میں سے بھی کچھ لے لیتے تھے (بحوالہ عینی شرح بخاری جلد 46/22)

بات صاف ہو گئی کہ — روایت میں قبضہ سے اوپر کا اضافہ ہے ہی نہیں اور عجلت پسندوں نے روایت میں واقع حرف "**من**" کا سہارا لے لیا ہے جس سے ان کے موقف کو اتنی تقویت ملتی ہے کہ داڑھی کے کچھ حصے پر ہاتھ صاف کیا کرتے تھے اور ان کے خیال یہ حصہ وہی ہے جو طول و عرض میں قبضہ سے باہر تھا۔ لیکن روایت کے الفاظ اس مفہوم کی نفی کرتے ہیں خاص کر "**حلق**" اور "**اخذ**" کے الفاظ کو ملانے سے داڑھی کی "کٹ" کا اشارہ ملتا ہے یعنی دائیں بائیں ریش کا جو حصہ کنپٹی سے ملتا تھا اسے تو سر کے بالوں کے ساتھ ہی تراش لیتے تھے اور ٹھوڑی کو تراشنے سے پرہیز کرتے تھے۔ گویا کہ آجکل کی زبان میں فرنچ کٹ داڑھی بنا لیتے تھے۔ کیوں کہ "**من**" کا قرینہ داڑھی کا کچھ حصہ تراشنے ہی کا متقاضی ہے — شارحین روایات نے بڑا زور لگایا ہے کہ موطا امام مالک کی اس روایت میں جو "**حلق**" (تراشنے) کا لفظ ہے اس کے مفہوم کو اپنے "ڈھب" کے مطابق بنا لیں چنانچہ اس غرض کے لئے حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں خوب طبع آزمائی بھی کی ہے' لیکن تھنوں سے نکلا ہوا دودھ واپس نہیں آ سکتا' اسی طرح "**حلق**" کا لفظ ایک تیر تھا جو امام مالک کی کمان سے نکل گیا اب اسے باز لانا شارحانہ تکلف کے ماسوا کوئی فائدہ نہیں دے سکتا تھا۔ سوچنے کا مقام ہے کہ قبضہ کے باہر جو بال لے لئے تھے ان کی صفت

"تحلیق" (منڈانا) کیوں کر ممکن ہے؟ منڈانا تو جڑ سے ہوتا ہے قبضہ سے باہر کیسے؟ کیا ہوا میں استرا چلا لیتے تھے؟ غرضیکہ اگر داڑھی رکھنے سے مشرکین کی مخالفت ہی مقصود تھی تو ایسی داڑھی ابو جہل نے بھی اپنے چہرے پر سجا رکھی تھی۔ اس کی مخالفت کی کیا صورت ہو سکتی تھی؟

مونچھیں جڑ سے اکھیڑ ڈالنی: داڑھی کی طرح مونچھیں جڑ سے اکھیڑ ڈالنے کا اشارہ ہے کیوں کہ مشرکین لامبی لامبی مونچھیں رکھتے ہیں لہٰذا ان کی مخالفت ضروری ہے لیکن مونچھیں کٹوانے میں جو مخالفت مطلوب ہے' واقعات کی تناظر میں وہ بھی بے محل معلوم ہوتی ہے کیوں کہ بعثت نبوی کا مقصد اگر اتنا ہی محدود اور کمتر مفاد کا حامل تھا تو صد حیف ہے کہ اتنی سی بات کے لئے آپ نے اپنی رسالت کا اہم وقت صرف کر دیا جبکہ آپ کے صحابہ کرام مونچھیں نہ کٹوا کر مشرکین کی موافقت ہی کرتے رہے۔ امام مالک اپنی سند کے ساتھ حضرت عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ:

انه كان اذا احذنه امر فتل شاربه

"خلیفہ دوم کو جب کوئی ملال انگیز معاملہ پیش آتا تو مونچھوں کو بٹنا اور "تاؤ" دینا شروع کر دیتے تھے۔" (موطا مالک)

اس کی وضاحت میں قاضی ابوالولید باجی (1081م) اور "الافعال" کے مصنف لکھتے ہیں کہ:

لو كان محلوقا ماكان فيه بما يفتل

"اگر فاروق اعظمؓ نبویؐ اشارے کے مطابق مونچھیں کٹواتے رہتے تو مونچھوں کو تاؤ دینا اور بٹنا کیوں کر ممکن ہو سکتا تھا۔!" (الباجی علے الموطا)

تبصرہ: داڑھی کے ضمن میں یہی وہ اکلوتی حدیث تھی جسے بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ لیکن اس کے دونوں اجزاء کی تحلیل کے بعد آپ نے دیکھ لیا کہ یہی

روایت حقیقت اور تاریخی واقعات کے تناظر میں کس قدر پوچ اور اپنے وزن تلے دبی ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ داڑھی کا عقیدہ کسی "دینی" عقیدے کی بناء پر نہیں تھا نہ ہی رسول اللہ ﷺ نے اسے کسی مرحلے پر اسلام سے نتھی کر کے اپنی امت کے لئے عمل اور کردار کی مشکلات پیدا کیں۔ خاص کر داڑھی رکھنے کی بنیاد صرف مخالفت پر ہے جبکہ انبیا کا یہ وطیرہ نہیں کہ مخالفت کا پہلو سامنے رکھ کر اپنے مشن کا آغاز کریں۔ تاہم فرض کرو مخالفت کے سابقہ معیارات کو ملحوظ رکھ کر اگر اس کا عکس المفہوم لیا جائے یعنی جب تمام کفار داڑھی رکھنا اور مونچھیں کٹوانا شروع کر دیں تو ہمیں انکی مخالفت میں ریش تراشی کو جزو دین بنانا چاہیئے۔ کیا خوب دین ہے۔

یہ یاد رہے کہ داڑھی خالص تمدنی چیز ہے۔ اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہر دور میں ایسی قومیں دیکھی گئی ہیں جنہوں نے بالوں کی حفاظت اور پرورش پر زور دیا ہے مثلاً برصغیر میں سکھوں اور عراق میں صابیوں کی مثال دی جا سکتی ہے۔ لیکن ہم کسی پر اعتراض کا حق نہیں رکھتے۔ میں داڑھی کلچر کا مخالف نہیں ہوں بلکہ اس تہذیبی اثر کو باقی رکھنے کا قائل ہوں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ اسلام کو اس سے مربوط کرنا یا شرط اول کے طور پر دانستہ نتھی کرنا صحیح نہیں ہے۔ داڑھی والوں سے میرا احترام کا رشتہ ہے' میرے والد صاحب باریش تھے' میں کیسے مخالفت کر سکتا ہوں پھر جن سے میرا فکری احترام ہے وہ بھی اصحاب **"لحیہ"** ہی تھے۔ سر سید یا چراغ علی' محسن الملک' محمد عبدہ' سید رشید رضا' مصطفیٰ المراغی" الکلام والے شبلی نعمانی' امام الہند ابوالکلام' عبید اللہ سندھی' خاکسار اعظم علامہ مشرقی' جن کی فکر سے ہند اور مصر میں روشنی پھیلی' داڑھی والے ہی تھے۔

رنگ حنا: امام ابن تیمیہ اپنے نظریہ مخالفت کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ

بخاری و مسلم نے ابو ہریرہؓ سے بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ داڑھی کو رنگ نہیں کرتے تم ان کی مخالفت کرو اور داڑھی کو خضاب لگاؤ' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم اہل کتاب سے "جنس مخالفت" ہی کا متقاضی ہے اور یہی مخالفت ہی شارع کا مقصود اولین ہے۔" (صفحہ 24 تا 25/ 26 تا 27)

امام صاحب مزید فرماتے ہیں کہ

داڑھی کا سفید ہونا ہمارے اختیار سے باہر ہے لیکن اس غیر اختیاری امر میں بھی اگر ہم نے اہل کتاب سے مشابہت اختیار کر لی تو ان میں سے ہو جائیں گے (حوالہ مذکور)

تبصرہ: یہ سب وہ طوق و سلاسل ہیں جو علما اپنی اپنی قوموں کی زینت بناتے رہے اور کہ جنہیں سید البشر ﷺ توڑ پھینکنے کے لئے تشریف لائے تھے لیکن صد افسوس کہ آپ ﷺ کی امت کے غلو شعار ائمہ نے پھر سے انہیں زینت گردن بنا ڈالا اور شکر ہے کہ ہم خدا کے فضل سے بالوں سے فارغ البال ہیں جس کی وجہ سے اس فتوے کی زد ہم گنہ گاروں پر نہیں پڑ سکتی لہٰذا اصحاب غلو اپنی خیر منائیں ہم ان سے بہ ادب صرف اتنا دریافت کرتے ہیں کہ —— **خالفوالمشرکین** —— میں داڑھی رکھنے کی یہ "علت" بتلائی گئی ہے کہ وہ منڈاتے ہیں یعنی دین کا نہیں صرف سیاست کا تقاضہ یہ ہے کہ داڑھی تمہارا یونیفارم ہو۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہ وہ "خضاب" نہیں کرتے تم داڑھی رکھنے کے اشتراک کے باوصف رنگ حنا سے داڑھی میں رنگ بہار لاؤ اور ان سے ممتاز ہو جاؤ؟ اب سوال یہ ہے کہ جب یہود و نصار داڑھی رکھتے ہیں اور ہمیں بھی حکم ہے کہ رکھو تو مخالفت کس بات میں؟ صرف رنگ میں؟ کاش یہ سوختہ پر وبال سوچ —— ہمیں ودیعت ہی نہ ہوتی۔ یہ یاد رہے کہ پاکستان' افغانستان وغیرہ میں جو لوگ داڑھی رکھتے ہیں اور سفید ہونے پر رنگ حنا سے کام نہیں لیتے وہ بھی "**خالفو**" کے مصداق یہود و نصارے کی صف میں شمار ہوں گے۔ ایسا ہی

فرمایا ہے امام ابن تیمیہ نے۔

داڑھی اور تمدن

احادیث صحیحہ اور اقوال ائمہ کی تصریحات سے واضح ہو چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں کفار اور دیگر مذاہب والے بھی داڑھی رکھتے تھے جس سے معلوم ہوا کہ یہ خالص تہذیبی چیز ہے اسے تبلیغ رسالت کا جزو اس معنی میں تسلیم کرنا کہ پہلے پہل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے اسے سنت قرار دے کر مسلمانوں کا شعار بنایا' غلط ہے۔ داڑھی رکھنا شعار تو اہل کتاب' مشرکین اور کفار کا بھی تھا۔۔۔ لہٰذا اسے کسی خاص قوم کا شعار کہا ہی نہیں جا سکتا یہ ایک تمدنی چیز تھی۔ اگر کسی قوم کے تمدن اور تہذیب میں اس کی گنجائش تھی بھی تو تہذیبیں بدلتی رہتی ہیں۔ کبھی عروج پر ہوتی ہیں اور کبھی زوال پذیر۔ ایسے میں اسے کسی بھی قوم کا شعار نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ تہذیبوں کا دھارا ہمیشہ ایک رخ نہیں بہا کرتا۔ پھر یہ صرف مسلمانوں پر ہی موقوف نہیں ہے۔ دنیا کے ہر حصہ میں دو متضاد عادتیں آج بھی رائج ہیں اور مشاہدہ گواہ ہے کہ آج بھی شہروں سے دور پہاڑوں اور دیہات میں بننے اور سنورنے کے لئے وقت کی قربانی نہیں دے سکتے لہٰذا وہ بلیڈ اور استرے کے تکلف سے کام نہیں لیتے۔ پھر ہل چلانے اور بھیڑ بکریوں کو چرانے کے لئے زیب و زینت کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس کے برعکس شہری کلچر مختلف زاویوں پر محیط ہے لہٰذا لوگ بننے' سنورنے اور اپنے کو زیادہ مہذب بنانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ کپڑوں کی استری سے لے کر چہرے کے میک اپ تک وقت نکال لیتے ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ عادات' رسوم کو دین کی ساخت و پرداخت میں کوئی دخل نہ ہونا چاہیے بلکہ اسلامی نقطہ نظر سے بھی جن احکام اور سنتوں نے عادات و رسوم کے راستے اسلامی مزاج اپنایا ان کے بدلنے سے ایسے احکام بھی بدل جاتے ہیں۔ چیف

جسٹس ابو العباس احمد مالکی (1292م) جو مصر کے ریونیو منسٹر تھے، لکھتے ہیں

کل ماھوفی الشرع یتبع العوائد یتغیر الحکم فیہ عند تغیر العادۃ الی ماتقتضیہ العادۃ المتجددۃ

"شرع کے جو امور خالص عادات (تمدن) سے تعلق رکھتے اور عادت ہی کے راستے شرع میں داخل ہوئے ہیں، بدلتی ہوئی عادات و تمدن کے ساتھ ساتھ ان کا حکم بھی بدل جائے گا اور اس کی جگہ نئی عادات اور تمدن کے نئے رواج کے مطابق نئی روشنی کے تقاضوں کے مطابق عمل ہو گا (بحوالہ **مجلۃ الاحکام العدلیہ** طبع مصر)

اس طرح بغداد کے حنفی چیف جسٹس امام ابو یوسف (798م) بھی تمدنی مسائل میں ردو بدل کو واجب سمجھتے اور یہاں تک کہتے تھے کہ ——

تمدنی مسائل اگر منصوص ہوں تو بھی بدلتے تمدن کے ساتھ نصوص کا ترک کرنا واجب ٹھہرے گا (بحوالہ **مجلۃ الاحکام العدلیہ**)

یہ حوالہ جات اپنے مفہوم میں واضح ہیں کہ تمدنی مسائل خواہ زبان وحی کے ذریعہ ہی وجود پذیر ہو، وہ تغیرپذیری کے قابل متصور ہوں گے۔ جزبز ہونے اور تلملانے کی ضرورت نہیں ہے۔ صحابہ کرام کے عہد میں بھی ایسا ہوتا رہا پہلے میدان جنگ کے لئے نفیر عام کے ذریعہ لوگوں کو اکٹھے کیا جاتا اور جو کچھ دشمن چھوڑ جاتا، اسے فوجیوں میں تقسیم کر دیا جاتا کہ تمام قوموں میں یہی رواج تھا لیکن بعد میں فوجی کلچر بدل گیا—— اور فوجیوں کو مشاہرے اور تنخواہ کی صورت میں خدمات کا معاوضہ دینے کا رواج پڑ گیا جس کی پابندی مسلمانوں کے لئے بھی لازمی ٹھیری۔ اسی طرح قبل از تاریخ سے لے کر زمانہ تاریخ تک یہ رواج چلا آتا تھا کہ مفتوحہ فوج کے تمام افراد مرد خواہ عورتیں میدان جنگ ہی میں جائداد منقولہ کی صورت میں فاتح عسکریوں کو بانٹ دیئے جاتے مگر قرآن چونکہ انسانوں کی آزادی کا پروگرام لے کر آیا تھا، اور اسی پروگرام کے مطابق ہی جنگ بدر کے تمام قیدی احساناً یا تاوان لے کر رہا کر دیئے گئے۔ فرمایا —— **امامنا بعد**

واما فداء — آیندہ ان قیدیوں کو یا تو احسان کرکے رہا کردو یا تاوان لے کر گھر بھیج دو (سورہ محمدؐ)

مانا کہ داڑھی کے لئے کچھ تحفظات فراہم کئے گئے ہوں گے لیکن ایک تو یہ تحفظات قانونی الفاظ میں حتمی نہیں تھے دوسرا بعض راویوں نے اپنی روایات کی خود ہی پابندی توڑ کر ان تحفظات کا وزن ختم کر دیا۔ ایسے میں "تشدد" پسندوں کا شریعت کو اپنی ہی خواہشوں کے سانچے میں ڈھال کر مسلمانوں کو غلو — اور ناہمواری کی راہوں پر کھینچ لانا — زیادتی ہے — امام مالک ایسے ہی موقع پر اپنی سند کے ساتھ لکھتے ہیں کہ — **ان سالم ابن عبداللہ کان اذا ارادان یحرم دعا بالجلمتین فقص شاربہ و اخذ من لحیتہٖ قبل ان یرکب**

سالم بن عبداللہ بن عمرؓ جب احرام باندھنے کا ارادہ کرتے تو قینچی منگوا کر مونچھیں اور داڑھی کتر ڈالتے (**موطا امام مالک' بمع شرح تنویر الحوالک** طبع مصر جلد 1/ 279)

اور ظاہر ہے کہ داڑھی کے مسئلہ کو دادا عمر خطابؓ اور پوتا سالمؒ یا ان کے والد عبداللہؓ — تمدنی چیز سمجھتے تھے اور لطف یہ کہ سبھی فقیہ صحابہ تھے۔ خاص کر عبداللہ بن عمر اور سالم بن عبداللہ کا شمار ہی مدینہ دلستان کے سات فقہا میں ہوتا تھا

داڑھی نہ کترنے والے قابل ستائش نہیں: ناظرین روشن ضمیر' آپ نے روایات سے معلوم کرلیا کہ یہود و نصاریٰ داڑھی نہیں رکھتے' ان کی مخالفت میں ہمیں اگانی چاہئے اور ساتھ ہی یہ کہ یہود و نصاریٰ خضاب نہیں کرتے' ان کی مخالفت میں ہمیں خضاب لگانا چاہئے۔ یہ داڑھی نہیں اور یہ داڑھی ہے والی بات ہمارے فہم ناقص سے باہر ہے تو کیا ہے کوئی نکتہ ورجو باور کرادے کہ جب وہ داڑھی رکھتے ہی نہیں تو کیا خضاب گالوں پر کریں گے؟ یا داڑھی تھی تو داڑھی

رکھ کر ہی ان کی مخالفت کرنا کیا معنی؟

اس وضاحت طلب امر کے ساتھ ہی ایک دو حوالے اس نوعیت کے حاضر کر رہا ہوں جو داڑھی کے تقدس کو متشبہ بنا رہے ہیں۔ مشہور سکالر جناب مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں کہ۔

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی المسجد فدخل رجل ثائرالراس واللحیہ فاشار الیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بیدہ کانہ یامرنا اصلاح شعرہ ولحیتہ ففعل ثم رجع فقال النبیؐ الیس ھذا خیرا من ان یاتی احدکم ثائرالراس واللحیہ کانہ شیطان۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے کہ ایک بے ہنگم ریش اور بالوں والا شخص مسجد میں داخل ہوا۔ آپؐ نے دیکھتے ہی داڑھی اور بالوں کی اصلاح کا حکم دے دیا چنانچہ حکم کی تعمیل بجالا کر جب وہ صاحب دوبارہ حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا— کیا ریش اور بالوں کی اصلاح بہتر ہے یا یوں بے ہنگم بال بڑھا کر "شیطان" بنے رہنا۔"

(کتاب اسلامی معاشیات کا ایک باب بحوالہ مجمع الفوائد بسند امام مالک، نقل از معارف اعظم گڑھ 1943 نمبر2 جلد 52)

اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی مرحوم فرماتے ہیں کہ "**کانہ شیطان**" کے آخری الفاظ بہت زیادہ قابل توجہ ہیں ان کے لئے جنہیں اپنی **ثائرالراس و اللحیہ**" والی شکلوں پر "ملکوتیت" کا مغالطہ لگا ہوا ہے۔" (معارف نمبر2، جلد نمبر52)

یہ حدیث پوری سند کے ساتھ موطا امام مالک میں بھی ہے۔ مگر اس میں واضح طور پر لکھا ہے کہ اس ملکوتی شکل کو آپ ﷺ نے مسجد نبوی سے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔ الفاظ ہیں کہ — **ان اخرج** — **(موطا امام مالک بمع**

شرح تنویر الحوالک مکتبۃ التجاریۃ الکبری مصر صفحہ 232)

غور فرمائیے **ثائر الراس** (بے ہنگم ریش والا) ایک صحابی اور نور نبوت سے "اصالتا" مستیز شخص تھا مگر داڑھی کو قینچی نہ لگانے پر نبی اکرم ﷺ نے اپنی زبانی اسے شیطان بھی کہا اور مسجد سے خارج بھی کر دیا۔

فاروق اعظمؓ کا ریش دراز سے نفرت کا اظہار:

اوپر کی حدیث میں **"اصلاح"** کا لفظ واقع ہوا ہے جس میں بلیڈ، قینچی اور بال تراش مشین کا یکساں اشارہ ملتا ہے کیوں کہ ذیل کی دوسری حدیث میں بلیڈ کی اگرچہ وضاحت نہیں ہے تاہم قینچی اور بال تراش مشین اس میں شامل ہے۔
امامؒ بدر الدین عینی حنفی (1451م) لکھتے ہیں کہ

انه (عمرؓ) رأى رجلا قد ترك لحيته حتى كبرت فاخذيجذ بهاثم قال ايتونى بجلمتين ثم امر رجلا فجزّ تحت يده (فقال بعده) يترك احدكم نفسه كانه سبع من السباع

حضرت عمرؓ خطاب نے ایک لامبی داڑھی والے کو دیکھا اور اپنے پاس بلا لیا اور اس کی داڑھی پکڑے رکھی اور قینچی لانے کا حکم دے دیا۔ جب تعمیل ہو گئی تو ایک شخص کو حکم دیا کہ بڑھے ہوئے بال کتر ڈالو۔ جب اس سے فارغ ہو گئے تو فرمایا۔ کیا تمہارا یوں "درندہ" بنے رہنا اچھا لگتا ہے؟"

(عینی شرح بخاری جلد 258/10 بحوالہ معارف اعظم گڑھ فروری 1943م)

معارف نے جس عینی کا حوالہ دیا ہے وہ غالباً بڑی تقطیع پر استنبول کی چھپی ہو گی۔ مصری چھاپے میں یہ حدیث طبع منیریہ جلد 12/ 46 پر موجود ہے اور یہی درست ہے۔

اس روایت میں خاص بات یہ ہے کہ جس طرح دو آدمی مل کر بھیڑبکری کے بال تراشتے ہیں، اسی طرح ریش دراز کو قابو کر کے کترنی سے بال تراشے گئے

تبصرہ: یہ واقعات' حوالہ جات اور احادیث صحیحہ غماز ہیں کہ داڑھی کے تقدس کے جو پیمانے مقرر کئے گئے ہیں' رسول اللہ اور فاروق اعظمؓ بلکہ ان شخصیات کے حوالہ سے تمام صحابہ کرام اس کا اعتراف نہیں کرتے تھے کیوں کہ یہ کوئی دینی مسئلہ نہیں تھا۔ تمدنی رسم تھی۔ آپ ﷺ اسے قابل قبول بنانے کے لئے آہستہ آہستہ اصلاح کے خواہش مند تھے اور ایک موزوں و مناسب صورت میں لے آنے کا ارادہ رکھتے تھے اور اس کے لئے آپ ﷺ نے یہی مناسب سمجھا کہ سردست اس "اثر" قدیم کو نہ تو محو کر دیا جائے اور نہ ہی موجودہ صورت میں رہنے دیا جائے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے آپ ﷺ نے مختلف طریقوں سے رہنمائی بھی فرمائی لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ داڑھی اسلام کا مقصود بالذات بھی تھی اور آنحضرت ﷺ نے واقعی اسے "سنت" بھی قرار دیا تھا' غلط ہے۔ ذیل میں خود زبان رسالت کی بیانی "سنت" کا مفہوم واضح کیا جا رہا ہے تاکہ احادیث نبویؐ کو پیش کرنے کے شعور سے محروم لوگوں کے لئے بصیرت کا کام دے سکے۔

داڑھی اور سنت

محدث اعظم امام طبرانی (991م) اپنی سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ:

السنۃ سنتان— سنۃ فی فریضۃ اصلھا فی کتاب اللہ تعالی اخذھا ھدی و ترکھا ضلالۃ والسنۃ التی اصلھا لیس فی کتاب اللہ تعالی۔ الاخذ بھا فضیلۃ ترکھا لیس بخطیئۃ۔

"سنت دو طرح کی ہیں' ایک سنت تو وہ ہے جس کی اصل اور بنیاد کتاب اللہ میں موجود ہے۔ اس پر عمل کرنا باعث ہدایت اور نہ کرنا موجب ضلالت ہے اور دوسری سنت وہ ہے جس کی اصل کتاب اللہ میں نہیں ہے اس پر چلنا بہتر ہے اور عمل نہ

کرنا کسی خطاء اور غلطی کو مستلزم نہیں۔" (طبرانی فی الاوسط)

تبصرہ: اس حدیث کو جلال الدین سیوطی (1505م) و دیگر محدثین نے صحیح کہا ہے (**جامع الصغیر طبع چہارم مصطفی جلبی** مصر جلد 38/2)
سنت کی اس تعریف کی روشنی میں دیانت اور رواداری کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ــــ فرمایئے کہ داڑھی کو اس معنی میں کہ اس کی اصل کتاب اللہ میں ہے آپ ﷺ نے کب سنت ٹھہرایا ہے ــــ جسے چھوڑنے سے جہنم یا ــــ معاذ اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت ــــ لازم آتی ہو؟ اگلے پچھلے کافر گر مل کر جواب دیں کہ سنت کے اس مفہوم کی رو سے عربی کے مبہم فقرے ــــ **من تشبہ بقوم فھو منھم** ــــ کی اصل اور بنیاد قرآن کی کس آیت سے معلوم کرلی گئی؟ تاکہ غیر عربی زبان' غیر عربی لباس اور غیر عربی عادات کو ضلالت اور یا کفر سے تعبیر کیا جاسکے؟ بلکہ اس مقالے میں جب اس فقرے پر فنی تنقید ہوگی تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ یہ حدیث ہی نہیں ہے' خود ایجاد مقولہ ہے۔ جو اپنے مفہوم میں واضح بھی نہیں ہے۔ اس وضاحت کے ساتھ ہی داڑھی کے "مناقب" میں امام ابن الجوزی (1200م) کے تبرکات پیش کر رہا ہوں تاکہ آپ پر واضح ہو سکے کہ اس کے تقدس کے باب میں جو کچھ سنایا جاتا ہے وہ طبع زاد اور جھوٹ ہے۔ صحابہ کرام اور آنحضرت ﷺ نے اس کی اصلاح کا حکم دے کر درازی والے تقدس کا بھرم کھول دیا ہے۔

ابن تیمیہ کی طرح امام عبدالرحمان ابن الجوزی بھی حنبلی تھے۔ فرق یہ تھا کہ جہاں ابن تیمیہ مطلب کی خاطر وضعی احادیث کا سہارا لینا ضروری سمجھتے تھے' وہاں ابن الجوزی محتاط تھے اور عقیدہ رکھتے تھے کہ دانستہ رسول معصوم ﷺ کو جھوٹ میں ملوث کر کے اپنے لئے جہنم کا سامنا کرنا مومن کو زیب نہیں دیتا۔

تبرکات ابن الجوزی: ابن الجوزی اپنی شہرہ آفاق کتاب "**اخبار الحمقاء**

والمغفلین" کے پانچویں باب میں "احمقوں" کے اوصاف کے عنوان کی ذیل میں لکھتے ہیں:

1۔ حماقت کی بے خطا نشانیوں میں سے طوالت ریش بھی ہے۔ کیوں کہ دراز ریش لازمی طور پر احمق ہی ہوتا ہے۔

2۔ روایت ہے کہ تورات میں لکھا ہے کہ داڑھی کی جڑیں دماغ سے نکلتی ہیں، پس جس کی داڑھی بڑھتی جائے گی، اسی تناسب سے اس کے دماغ میں فتور واقع ہو گا اور عقل میں کمی آ جائے گی اور عقل میں کمزور احمق ہی ہوتا ہے۔

3۔ حکماء اور دانشوروں کا قول ہے کہ حماقت داڑھی کے لئے بمنزلۂ کھاد کے ہے۔ جس کی داڑھی لمبی ہو گی اسی تناسب سے اس کی حماقت میں اضافہ ہو گا۔

4۔ ایک ریش دراز کو دیکھ کر فرزانوں نے کہا کہ بخدا اگر کسی نہر کے کنارے اگتی تو اسے خشک بنا دیتی۔

5۔ احنف بن قیس (691م) کا قول ہے کہ جب کسی کو دراز ریش دیکھو تو اس پر حماقت کا حکم لگا دو۔ اگرچہ **امیہ بن عبد شمس** (بن ہاشم — قریش) جیسا عقیل اور فرزانہ ہی کیوں نہ ہو۔

6۔ حضرت امیر معاویہؓ (680م) کو ایک شخص نے آداب مجلس کا خیال نہ کرتے ہوئے کچھ کہہ دیا تو آپ نے اسے یہ جواب دیا کہ تیری حماقت اور تیری بے عقلی کی پختہ دلیل تیری لامبی داڑھی ہے۔

7۔ خلیفہ عبدالملک بن مروان (715م) کا قول ہے کہ جس کی داڑھی لامبی ہو گی وہ عقل میں کھودا ہو گا۔

8۔ حضرت عروہ بن زبیر تابعی (715م) فرماتے تھے کہ جس کا قد — کوتاہ کھوپڑی چھوٹی اور داڑھی لمبی دیکھو — بلا تردد اس کی عقل کے متعلق فیصلہ کر دو کہ احمق ہے۔

9۔ فلاسفروں کا کہنا ہے کہ جس کا قد چھوٹا اور داڑھی لمبی ہو تو اس پر

"احمق" کا اطلاق کر دو۔ اور جس کی کھوپڑی بھی چھوٹی دیکھو تو اس کے عقل باختہ ہونے میں شک ہی نہ کرو۔

10۔ حکماء کا قول ہے کہ عقل کا مقام دماغ اور سانس کا راستہ ناک ہے لیکن **موضع الرعونه طول اللحیۃ** "رعونت (غرور) کی جگہ لمبی داڑھی ہے۔" (واللہ یہ تو کوئی الہامی فیصلہ لگتا ہے۔ طارق)

11۔ امام سعید بن منصور کہتا ہے کہ میں نے امام شافعی (820م) سے دریافت کیا کہ کبھی حفصہ بن سلام سے بھی ملاقات ہوئی ہے؟ فرمایا ہاں ریش دراز کودن تھا۔

12۔ فالنامے والے امام ابن سیرین تابعی (728م) کہا کرتے تھے کہ جس کی داڑھی لانبی دیکھو' اس پر بے وقوف کا فیصلہ جڑ دو۔

13۔ زیادؓ بن ابیہ صحابی (673م) کا قول ہے کہ جس تناسب سے داڑھی لانبی ہوتی جائے گی اسی تناسب سے فتور عقل بڑھتا جائے گا۔

14۔ شاعر کا قول ہے کہ:

اذا عرضت للفتیٰ لحیۃ

وطالت فسارت الی سرتہٖ

فنقصان عقل الفتیٰ عندنا

بمقدار مازا فی لحیتہ

جس مقدار سے کسی کی داڑھی بڑھتی جائے گی اسی تناسب سے عقل میں کمی آتی رہے گی۔ (**اخبار الحمقیٰ والمغفلین**' طبع مصر' کاپی نمبر3' صفحہ 17)

یا پہلوانی — یا تقیہ: سابقہ میں ابن تیمیہ نے "**تشبہ**" کے ماتحت کسی بھی مسلمان کو معاف نہیں کیا اور تکفیر کی چھری تلے بے دریغ گردنیں کاٹتے چلے گئے لیکن جب چھری کند ہو گئی تو احساس ہوا کہ دارالحرب کے مسلمانوں کے لئے

کچھ گنجایش نکال لینی وقت کی اہم ضرورت ہے بلکہ بڑھ کر ضرورت ہے۔
فرماتے ہیں۔

> جو مسلمان دارالحرب یا دارا لکفر (اگرچہ پر امن جگہ) میں رہتے ہوں تو ان پر اہل کتاب کی مخالفت لازم نہیں ہے بلکہ انہیں بڑھ چڑھ کر موافقت اور ظاہرداری سے کام لینا چاہئے تاکہ اس طرح ان کے شراور ضرر سے محفوظ ہو سکیں۔ نیز دین کی مصلحت اور بھلائی اسی میں ہے (صفحہ 184)

تبصرہ: عزیمت کا درس دینے والے ابن تیمیہ کو زندگی ہی میں احساس ہو گیا کہ ہمہ گیر تشدد اور ہمہ گیر بائیکاٹ سے اسلام کا دائرہ سکڑ کر رہ جائے گا کیوں کہ غیر فطری نظریات کا طوق زینت گردن بنا لینے کے بعد فطری نتائج کا ظاہر ہونا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے "**تقیہ**" کی پالیسی عطا فرما کر ہمہ گرفت کا ازالہ کرنا چاہا لیکن کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ "رخصت" کا فارمولا بروئے کار لانے کا مشورہ دے دیتے تاہم اس کے معنے یہ نہیں کہ آپ کی پالیسی بدل گئی ہے؟ پالیسی تو اب بھی وہی ہے کہ غیر عربی زبان' لباس اور کلچر کو اپنانا ازروئے **تشبہ** حرام ہے۔

تشبّہ کی حدیثیں رجال کے محاذ پر

حدیث زیر بحث کو چھیڑنے کی شاید ضرورت پیش نہ آتی اگر محدثین ثقات نے اسے گھٹیا درجے کی ضعیف کہہ کر ہماری حوصلہ افزائی نہ کی ہوتی۔ لہٰذا ہم حق گوئی کے صلہ میں ان کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہوئے انھیں یقین دلاتے ہیں کہ ان کے اصولوں کا احترام کرتے ہوئے "**من تشبہ**" کی روایات کا جائزہ لیں گے۔

اس حدیث کے متعلق امام عبدالرؤف مناوی (1662م) نے پوری صراحت

سے لکھا ہے کہ ضعیف ہے۔ (المناوی طبع مصر جلد 6 / 105)

اسی طرح امام عبدالعظیم مندری (1258م) امام سخاوی (1496م) اور امام عبدالرحیم عراقی (1404م) نے بااختلاف الفاظ — غیر مبہم طور پر ہی اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ (عون المعبود طبع اول جلد 4 / 58)

آیئے اب ضعف کی وجوہ معلوم کر لیجئے — اور اس سے پہلے سندوں کی تفصیل۔

(1) احمد بن جنبل' محمد بن یزید واسطی' عبدالرحمان بن ثابت بن ثوبان — حسان بن عطیہ — ابی منیب جرشی — عبداللہ بن عمر — نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (مسند احمد' صفحہ 50)

(2) یہی سند مگر واسطی کی بجائے ابو النضر' پھر وہی عبدالرحمان تا آخر (مسند احمد صفحہ 93)

(3) ابو داوٗد' عثمان بن ابی شیبہ' ابو النضر' عبدالرحمان بن ثابت پھر سابقہ سند (بحوالہ عون المعبود جلد 4) ان تینوں اسناد میں مرکزی راوی صوفی عبدالرحمان دمشقی (778م بعمر 90 سال) ہے جو بایں زہد و تقویٰ — حدیث کے معاملہ میں بد احتیاط اور درجہ اول کے بے اعتبار تھے۔ امام نسائی کہتے تھے کہ یہ شخص حدیث میں بالکل توانا نہیں تھے۔ ابن عدی نے اسے ضعیف لکھ کر پھر کہا کہ اس کی حدیث کسی بھی موضوع پر ہو' ناقابل اعتبار ہے' دل لگی کے طور پر لکھ لینی چاہیے — امام اوزاعی (صاحب المذہب) نے کہا کہ عبدالرحمان کا دماغ خراب ہو چکا تھا — مرفوع القلم پاگل تھا — باوجودے کہ یہ حدیث "**من تشبہ**" کے راوی اور امام احمد کے استاذ الاستاذ ہیں پھر بھی امام احمد نے فرمایا کہ اس کی تمام حدیثیں "مناکیر" اور بے بنیاد ہیں۔ عقیلی نے کہا کہ جب کسی روایت میں تنہا عبدالرحمان دمشقی ہو تو وہ روایت مسترد کر دی جائے۔ جیسے کہ زیر بحث تینوں سندوں میں تنہا عبدالرحمان ہی راوی ہے۔ اسی طرح مناوی نے بھی اسی عبدالرحمان ہی کی وجہ سے حدیث "**من تشبہ**" کو ضعیف قرار دیا ہے — یہ

پاگل ہونے سے پہلے خشک مزاج زاہد اور بقول امام ذہبی "خارجی" بھی تھا۔ اور خارجی اصولوں کے تناظر میں "اعمال" کی ظاہری پاسداری نہ کرنے سے کفر لازم آتا ہے۔ یہ خارجی معمولی سی مذہبی یا سیاسی لغزش پر مخالف کو واجب القتل کہتے تھے۔ یہ زہد میں غلو سے کام لیتے تھے یعنی عبدالرحمان ایک کریلا دوسرا نیم چڑھا تھا جبکہ خشک زہد اور بے رحم خروج جہاں اکٹھے ہوں تو تنگ ظرفی اور سخت گیری سے کیوں کر بچا جا سکتا ہے؟ امام ابن حبان (965) کتاب **المجروحین** میں لکھتے ہیں—

جن راویان احادیث کی توجہ عبادت اور زہد کی طرف بڑھ گئی احادیث کو سمجھنے اور صحیح طریقے پر بیان کرنے کی صلاحیت ان میں نہیں رہی' اور اسی فقدان فہم کی وجہ ہی سے ان کی احادیث میں بے بنیاد مواد کثرت سے شامل ہو گیا اور وہ اسے پورے وثوق سے بیان کرتے رہے جبکہ ایسے زاہدوں کی روایتیں کلی طور پر مسترد کر دینی چاہئیں (بحوالہ **صیانہ الانسان** طبع سوم مصر 1378ھ' صفحہ 52)

اسی طرح امام ابن الاصلاح (1243م) نے "مقدمہ" میں لکھا ہے

جس راوی کی روایت میں شاذو بے بنیاد روایتوں کا سراغ لگ جائے' اس کی روایتیں قبولیت کا اعزاز حاصل نہیں کر سکتیں

(بحوالہ **صیانہ الانسان** صفحہ 87)

ادھر آپ معلوم کر چکے کہ امام احمد اپنے استاذ الاستاذ اور حدیث "من تشبہ" کے اکلوتے راوی عبدالرحمان مذکور کی تمام روایتوں کو بے بنیاد یعنی منکر روایات میں شمار کرتے ہیں۔ ابن حجر لکھتے ہیں کہ

جو راوی غلط بیان یا فاترالعقل ہو تو اور منکر مواد پیش کرنے کا عادی ہو اس کی روایت مسترد ہے۔ (**نخبہ الفکر** صفحہ 30 طبع مصر)

یہی حدیث طبرانی نے "**الاوسط**" میں حذیفہ بن الیمانؓ سے روایت کی ہے جس کے متعلق امام ہیثمی (1404م) لکھتے ہیں کہ اس کی سند ابو داؤد والی سند کی بہ نسبت قبول ہو سکتی ہے۔ مقصد یہ کہ ابوداؤد والی سند عبدالرحمان کی

وجہ سے بالکل ہی ناکارہ ہے۔ چلو مانا کہ طبرانی کی سند نسبتاً بہتر ہے تو اس کا کیا کیا جائے کہ اس کی سند کا دوسرا راوی ''علی بن غراب'' ابو زرعہ' دار قطنی اور ابن معین کی چشم پوشی کے باوصف کذاب' دروغ گو اور جھوٹی احادیث وضع کرنے کا عادی تھا۔ امام ابن حیان نے اسے وضاع کہا ہے۔ جوزجانی کہتا تھا کہ اس کی تمام روایتیں پایہ اعتبار سے گر چکی تھیں۔ امام ابو حاتم نے کہا قابل اعتبار بھی نہیں تھا اور زیادہ خطرناک بھی نہیں۔

ان وجوہ کی بناء پر **من تشبه** ایسے پائے کی ثابت نہیں ہو سکتی جس پر ایمان اور کفر یا حلال اور حرام کی بنیاد رکھی جا سکے۔

حدیث —— **من تشبه بغیرنا فلیس منا** —— کا اپریشن

ابتداء میں یہی حدیث الفاظ کے معمولی اختلاف سے ترمذی کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے جس کے الفاظ تھے کہ:

من تشبه بغیرنا فلیس منا —— آیئے اس کی سند بھی ملاحظہ فرمایئے

قتیبه —— عبدالله بن لهیعه —— عمرو بن شعیب —— عن ابیه عن جده —— نبی اکرم صلی الله علیه وسلم

اس کی سند کا دوسرا راوی مصر کے قاضی عبداللہ بن لہیعہ (789 م) واقع ہے جسے امام ابن معین —— امام عبدالرحمان بن مہدی —— امام یحییٰ بن سعید —— امام ابو زرعہ —— امام نسائی —— امام ابو حاتم —— ابو عبداللہ —— امام ابن حبان —— اور امام بخاری نے ضعیف' مدلس من گھڑت احادیث بیان کرنے کا عادی اور ناقابل احتجاج قرار دیا ہے۔ 785 م میں اس کا ذاتی کتب خانہ اور ضروری مسودات جل گئے تھے اس کے بعد جو محدثین تھوڑا بہت اس کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے وہ بھی محتاط رہنے لگے کیوں کہ اب یہ امتیاز کرنا مشکل ہو چلا تھا کہ وہ کتابیں جلنے

کی وجہ سے دماغ خراب ہونے کے بعد کی روایت بیان کر رہا ہے یا پہلے کی سند کے ساتھ ---؟

اسی طرح سند کے دوسرے راوی عمر بن شعیب (734 م) کی ثقاہت بھی مشتبہ ہے کیوں کہ یہ بے اصل حدیثیں بیان کرنے کا عادی تھا۔ امام احمد اس کی احادیث کو تیسرے درجے کا جھوٹ (منکر) کہہ کر مسترد کر دیتے تھے --- امام یحییٰ بن القطان اس کی تمام احادیث کو "واہی" کہتے تھے ---۔ معمر بن سلیمان اور ابو عمرو بن العلاس کہتے تھے کہ عمرو بن شعیب اور قتادہ ایک ہی سطح کے غیر معیاری راوی تھے۔ جس کسی سے کوئی بات سنتے اسے حدیث کی طرح بیان کر دیتے جس سے ان ہر دو کا اعتبار کا ختم ہو گیا --- امام ابو داؤد اور --- ابن حبان کہتے تھے کہ اس کی روایتیں حجت نہیں ہیں۔ امام ابن معین --- ابن ابی شیبہ --- اور ابن المدینی کہتے تھے کہ عمرو جو روایت بھی اپنے باپ شعیب کے واسطہ سے بیان کریں' جھوٹ ہے کیوں کہ یہ ہنوز شیر خوار بچہ ہی تھا کہ اس کا والد فوت ہو گیا --- دادا نے تعلیم و تربیت کی۔ یہاں جرح کا یہ زاویہ ملحوظ رکھا گیا ہے کہ دیگر جرحوں کے علاوہ عمرو مذکور اس حدیث کو اپنے باپ شعیب ہی کے توسط سے بیان کرتا ہے۔ جو کہ جھوٹ ہے --- اتنی واضح جرحوں کی موجودگی میں یہ دونوں حدیثیں اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر مسلمانوں کی تقدیر کا فیصلہ کیا جائے ---

یعنی کہ I --- حدیث **من تشبہ بقوم فھو منھم** --- جہاں مبہم ہے' وہاں جھوٹی بھی ہے اور

II حدیث --- **من تشبہ بغیرنا فلیس منا** --- بھی وضعی ہے۔ اصول حدیث' اصول روایات اس پر گواہ ہیں۔

شبہات کی آندھیاں

میرا یہ مقالہ پہلی بار 1961ء میں طبع ہو چکا تھا اور امید تھی کہ سنجیدہ فکر و نظر سے بہرہ وافر پانے والے اہل قلم اس کا تنقیدی جائزہ لے کر صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں معاون ثابت ہوں گے لیکن صد افسوس کہ راقم کی یہ امید بر نہ آئی۔ لاہور کے بعض علم دشمن حلقوں کی طرف سے عدالت میں کیس ضرور دائر کر دیا گیا تھا مگر عدالت نے اس فیصلہ پر مدیر "نصرت" کو روانہ کر دیا کہ زیر عتاب مقالہ کا جواب موصول ہونے پر اسے "نصرت" ہی میں شائع کر دیا جائے۔ اس کے بعد ہوا یہ کہ کسی بھی حلقے کی جانب سے جواب کی ہمت ہی نہیں کی گئی اور رفتہ رفتہ علم دشمنوں کا جوش و خروش از خود ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس کے بعد یہی مقالہ تیرہ سال بعد دوبارہ اسی نصرت ہی میں 1972ء میں شائع ہونا شروع ہو گیا۔ اب کی بار رقیبوں کے اسی ہی گروہ کی رگ حمیت پھڑکی لیکن ان کی ذمہ داری تھی کہ 12 سال پہلے عدالت کے حکم کے مطابق جواب داخل عدالت کرتے لیکن فتویٰ بازوں کے اسی گروہ نے ایسی پھرتی نہیں دکھائی۔ اسی طرح آج 39 سال ہو چکے ہیں مگر عدالتی جواب نہیں آیا۔ اب جو دوسری اشاعت پر غیر سرکاری جواب جو صرف شبہات پر مشتمل ہے، سامنے ہے اور 47 فقروں میں اس کا جواب بھی حاضر ہے (طارق)

1. سرسید نے شعور و آگہی کی جو خیرات بانٹی ہے۔ برصغیر کا مسلمان رہتی دنیا تک اس سے زندگی پاتا رہے گا۔ ایسی اولوالعزم شخصیت کو طنز و تشنیع کا نشانہ بنانا اپنی عاقبت خراب کرنے کے مترادف ہے، بے ریشوں کو مشق تکفیر بنانا تو سمجھ میں آ سکتا تھا مگر باریش کو آڑے ہاتوں لینا عجیب ستم ظریفی ہے! وہ سرسید سے پہلے حضرت امام اعظم (767م) کو بھی اپنے فتوؤں کے نشتروں سے چھلنی کرتے رہے، منکر حدیث، صاحب ہوا اور نہ جانے کن کن القاب سے یاد کر کے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتے رہے مگر ان کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے کیوں کہ فطرت کا

اٹل قانون ہے کہ:

اگر گیتی سراسرباد گیرد   چراغ مقبلاں ہرگز نہ میرد

2۔ مجھے افسوس ہے کہ میں صلح کل ہو کر بھی دفاعی لہجہ اختیار کرنے پر مجبور ہوا ہوں مجھے تو بالکل ہی خاموش ہونا چاہیے تھا لیکن میں کیا کروں کہ میری خاموشی سے علم دوستوں کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑے گا اور وہ بجا طور پر میری طرف دیکھ لیں گے کہ میرا جواب کیا ہوتا ہے؟ مزید افسوس ہے کہ میرے مدمقابل سنجیدہ فکر و نظر کے لوگ نہیں پھکڑباز یا جذباتی ذہن کے حضرات ہیں' یہ حمایت حدیث کے دعوے دار تو ضرور ہیں لیکن عملی طور پر ان ہی احادیث کو مانتے ہیں جو ان کی ہوائے نفس اور گروہی جانبداری کی مئوید ہوں۔ یہاں واضح نشاندہی اگرچہ میرا مقصود نہیں ہے لیکن عقل و شعور سے بیگانہ لوگ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ عصر حاضر میں علم و سائنس نے ادراک و مشاہدے کے قالب میں ڈھل کر انسانیت کو جس مضبوط فکری توانائیوں سے نوازا ہے ان سے بے نیاز ہو کر ہم کبھی بھی صحیح نتائج تک نہیں پہنچ سکتے۔

3۔ یہ دور تعقل پسندی' واقعیت اور خود افروزی کا دور ہے اسی میں سب کی فلاح کا راز مضمراور فوزو کامرانی کی راہ دیکھی جا سکتی ہے۔ فرد ہو یا نظریہ اس پر تقدس کی چھاپ لگا کراور اس کے بارے میں اندھی عقیدت کے حصار میں گھر کر فکری صلاحیت کو ماؤف یا مفلوج کر لینا ارتقاء کے فکری عمل کے انقطاع کے مترادف ہے۔

4۔ طالبان آگہی جانتے ہیں کہ انسان کی روشنی طبع' حسی رغبات اور جمالیات کے خلاف کوئی بھی قدغن عائد کرنا برداشت نہیں کر سکتی۔ حضرت انسان کل تک عقیدت کے حصار میں گھر کر جس چیز پر عقیدت کے پھول چڑھاتا تھا آج اس کا فہم و ادراک ہمہ قسم التباس کے پردے ہٹا کر حقیقت کے رخ زیبا کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے۔ "آج عقلیت پسندوں" کو الزام دینا کہ وہ "مذہبی"

اخلاقیات کا شعور نہیں رکھتے' فکر و شعور کا کھلا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ وہ خود سوچیں کہ وہ کسی بھی الزام کی تائید میں کہاں تک ٹھوس حقائق پیش کر سکے ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ان کا طریق استدلال مفلوج' ماخذ سراسر جارحانہ اور طرز نگارش بالکل ہی تشنہ ہے—— وہ جب کبھی کسی پر گرفت کرنا چاہتے ہیں تو اپنے قارئین کی صحیح رہنمائی کرنے میں ناکام رہ جاتے ہیں۔

اسلام اور کفر میں حد فاضل 'لباس اور چہرہ یا عقیدہ؟

جیسا کہ اشارے کی زبان میں عرض کر چکا ہوں کہ عرصہ تیرہ سال پہلے میں نے حدیث "**من تشبہ بقوم فھو منھم**" کا جائزاتی مطالعہ کیا تھا اور میرا شعور اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ "کسی قوم سے شکل اور لباس کی مشابہت ہی اگر اخراج از اسلام کا موجب بن سکتی ہے" تو اس طرح کائنات بشری کی بیشتر آبادی اسلام کی حیات افروز تعلیمات سے محروم اور اسے قبول کرنے سے گریزاں رہے گی۔ اور دنیا میں ظہور اسلام کے مطلوبہ نتائج و فوائد حاصل نہ ہو سکیں گے۔ میرا مقصد یہ تھا کہ لباس اور چہرے کی مشابہت کو اسلام اور کفر میں حد فاضل قرار دینے کی بجائے عقیدے ہی کو امتیازی حیثیت حاصل ہونی چاہیے یعنی جو شخص توحید و رسالت پر ایمان و عقیدہ رکھتا ہو اسے مسلم تصور کر لیا جائے اور جو اس سے منحرف ہو اسے غیر مسلم سمجھا جائے۔ چنانچہ میں نے اسی زاویہ ہی سے حدیث "**من تشبہ بقوم فھو منھم**" کا جائزہ لے کر روح اسلام کے منافی ثابت کر کے ناقابل عمل ٹھہرایا تھا۔

5۔ اس حدیث کی زد سے یوں تو زندگی کا کوئی بھی شعبہ نہیں بچ سکتا تھا۔ تاہم اس کا زیادہ تر تعلق لباس اور اور چہرے ہی سے ہو سکتا تھا چنانچہ لباس کے ضمن میں تنقیدات کا جواب تو ان سے نہیں بن پڑا البتہ چہرے کے بارے میں ان کے تاثر غیض آلود اور رگ حمیت رقصاں رہی ہے۔

6۔ وہ کہتے تھے کہ حدیث **من تشبہ بقوم فھو منھم** کی روح کو زندہ و تابندہ رکھنے کے لئے ایک دوسری حدیث **خالفوالمشرکین و احفوالشورب واعفو اللحی** کو ملحوظ رکھنا ہو گا۔ اس حدیث کے معنی ہیں:

"داڑھی بڑھا کر اور مونچھیں کٹوا کر مشرکین کی مخالفت کرو۔"

اس حدیث کی بابت میری معروضات اس طرح کی تھیں کہ "یہ الفاظ کسی دینی عقیدے کے طور پر نہیں بلکہ کسی خاص مصلحت کے باعث مشورے کے طور پر فرمائے گئے ہوں گے۔"

کیوں کہ اگر دینی عقیدہ ملحوظ خاطر ہوتا تو اس پر سب سے زیادہ عمل کرنے والے صحابہ کرام ہی ہوتے کہ دین کا مزاج سمجھنے میں انھیں کوئی دقت پیش نہیں آ سکتی تھی مگر اس فرمان کی موجودگی میں خلیفہ راشد عمر فاروقؓ کا طرز عمل واضح کرتا ہے کہ آپ اسے دینی عقیدہ تصور نہیں کرتے تھے آپ کی لمبی لمبی مونچھیں آپ کے عمل پر زندہ شہادت فراہم کر رہی ہیں۔

7۔ اس سے میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ میں کسی کے شہپروں کا قائل ہوں۔ اور ان کا اثبات میرا فریضہ ہے۔ میں تو صرف باہم متضاد احادیث کے تناظر میں دکھلانا یہ چاہتا تھا کہ مشرکین کی مخالفت کے لئے جو ظاہری علامات بتلائی جا رہی ہیں ان کا دینی تصور مجروح ہے اور اسی بناء پر ہی حدیث ہذا کی فنی تحلیل کے دوران ایک مقام پر میں نے لکھا تھا اور اسے ہی ناقد محترم نے بھی ہدف تنقید بنایا ہے کہ:

"اگر مونچھیں کٹوا کر مشرکین کی مخالفت ہی بعثت نبوی کا مقصد تھا تو (الف) صد حیف ہے کہ اتنی سی بات کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رسالت کا اہم وقت صرف کر دیا (ب) پھر اس کے باوجود بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مونچھیں نہ کٹوا کر مشرکین کی موافقت ہی کرتے رہے۔ امام مالک اپنی سند کے ساتھ حضرت عمر بن الخطاب سے روایت کرتے کہ **اذا احزنه امر فتل شاربه** یعنی خلیفہ دوم کو جب ملال انگیز معاملہ پیش آتا تو مونچھوں کو بٹنا اور تاؤ دینا

شروع کر دیتے۔"

یہ میں نے لکھا تھا اور جس پس منظر میں لکھا تھا اس کی صحت پر آج بھی مجھے یقین ہے اور اس کے بعد جو نتیجہ اخذ کیا تھا اس کی صداقت پر بھی میرا ایمان ہے۔ لیکن ناقد محترم نے میرا اقتباس دینے کے بعد نہ تو "نصرت" کا حوالہ دیا ہے اور نہ ہی اس اقتباس کے خاتمہ پر ریفرنس کے طور پر دیے گئے حوالوں کی نشاندہی کی ہے کیا اس سے یہ واضح نہیں ہوتا ہے کہ ان کے لاشعور میں یہ وہم سما چکا تھا کہ مبادا ان کا کوئی عقیدت مند "نصرت" کے مذکورہ پرچے حاصل کر کے ان کے تناظر میں تنقید نگار کی جہالت کا اعتراف کر بیٹھے۔

8۔ اب میں اس پر اصرار نہیں کروں گا کہ تنقید نگار نے جس کوتاہی کا ارتکاب کیا ہے اس سے برملا تائب ہو جائیں۔ البتہ میرا یہ مطالبہ شدت اختیار کر گیا ہے کہ وہ یا کوئی اور مائی کا لال اپنے اندر اگر اخلاقی جرات رکھتا ہے تو میرے پیش کردہ حوالے اور اس سے اخذ کردہ نتیجہ کی کھلی تکذیب کر دکھلاوے۔

ژولیدہ فکری کا شاہکار

یہ حضرات بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ فرماتے ہیں کہ

اذا احزنه امر فتل شاربه سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی لمبی لمبی مونچھیں تھیں۔" (اہلحدیث لاہور 23 مارچ 1973ء صفحہ 6 کالم 1)

سوال یہ ہے کہ اگر مونچھیں بٹنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ لمبی تھیں تو کیا یہی لازم آتا ہے کہ صفاچٹ تھیں اور فاروق اعظمؓ یوں ہی انگلیوں سے "ہوا" کو بٹنا شروع کر دیتے تھے؟

9۔ دماغی اختلال کا عارضہ اگر لاحق نہ ہو تو اس تاویل کے بعد آپ کو یہ نہ کہنا چاہیے تھا۔

"ان جان فروشوں کی حالت یہ ہو کہ وہ حضور کے ارشادات پر عمل کرنے کے

لئے بے تاب رہتے ہوں ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔" (حوالہ مذکور)۔

کیوں اس طرح آپ ایک ہی سانس میں فاروق اعظمؓ کی شہپر نوازی کا اعتراف کر کے خود ان کی لمبائی کا جہاں انکار کر جاتے ہیں وہاں محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے منافی سمجھ کر سرے سے ان کے وجود کا اعتراف ہی غیر ضروری سمجھتے ہیں۔

شہپر بردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صحبت یافتہ نہیں ہو سکتا؟

ایک مقام پر ناقد محترم نے سات احادیث پیش کر کے یہ تاثر دیا ہے کہ:
مونچھیں صاف کرنا امر فطری کے مطابق اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ سے بالکل ہم آہنگ ہے بلکہ زید بن ارقم کی حدیث کے مطابق مونچھیں صاف نہ کرنے والا مسلم سوسائٹی سے خارج ہے (نسائی) وغیرہ وغیرہ (صفحہ 6 کالم 1 اور 2)

اس تناظر میں وہ فرماتے ہیں کہ:

ان ادلہ کے ہوتے ہوئے پھر حضرت عمرؓ جیسے متبع السنہ سے یہ توقع رکھنا غلط ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو نہ مانتے ہوئے اپنی مرضی سے مشرکوں کی موافقت ہی کرتے رہے۔

(الحدیث 23 مارچ 1973 صفحہ 6 کالم 2)

10۔ اجی حضرت! مشرکین کی موافقت شرک یا کسی بڑے عقیدے میں نہیں کرتے رہے آپ خواہ مخواہ جسم کے کسی خاص حصے کے بالوں کو اسلام اور کفر کے مابین حد فاصل قرار دے کر اپنے جی سے سنت نبوی کا تعین نہ کریں کہ اس طرح نہ تو فاروق اعظمؓ آپ کے ناکارہ شعور کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں اور نہ ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی منشاء کی ذمہ داری قبول کر سکتے ہیں۔ ہاں اگر آپ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ ان ادلہ کے ہوتے ہوئے فاروق اعظمؓ کے

شہپروں کا وجود تسلیم ہی نہیں کیا جا سکتا تو پھر آپ کو اپنے ہی دماغ کی خیر منانی چاہیے کہ **"فتل"** (بٹنے) کی حسب ذیل تاویل کس بنیاد پر آپ نے کی ہے؟

"ادلہ مذکورہ کی روشنی میں— **اذا احزنه امر فتل شاربه**— کا مفہوم یہ ہے کہ باچھوں کے کناروں پر مونچھوں کے جو بال ہوتے ہیں ان کو تاؤ دینا اور بٹنا مراد ہے جیسا کہ آج کل ہمارے ہاں ایسے بیسیوں آدمی ہیں کہ جنہوں نے منہ کے دائیں بائیں جانب مونچھیں رکھی ہوتی ہیں اور ہونٹوں کے اوپر بال منڈائے یا کترائے ہوتے ہیں — (الہدیث 23 مارچ 1973 صفحہ 6' کالم نمبر 2' 3)

کیوں کہ آپ کی یہ تاویل غماز ہے کہ آپ شہپروں کے وجود کے انکار کی جرات نہیں کر سکتے تاہم ہمارے لئے مشکل ہے کہ آپ کسی ایک موقف پر ٹھہر کر بات نہیں کر سکتے یا تو سرے سے تبع السنہ کی آڑ میں مونچھوں کے وجود ہی کے منکر ہیں یا پھر طبعزاد مفہوم تراش کر امید رکھتے ہیں کہ دوسرے بھی آپ کی حکیمانہ تشریح کو تسلیم کر لیں؟

11۔ کیا آپ فرما سکتے ہیں کہ عربی میں **"شارب"** ان ہی بالوں کو کہا جاتا ہے جو باچھیوں سے متعلق ہیں؟ کیا اس طبعزاد مفہوم کی آپ کے پاس کوئی سند ہے؟ پھر اگر باچھوں سے متعلق بالوں ہی کو **"شارب"** کہا جاتا تھا تو کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مجوسیوں کے ایسے ہی بالوں کی مخالفت کی تلقین فرماتے رہے؟ مجھے امید ہے کہ حضرت مولانا بالفضل اولانا حضرت العلام محمد الیاس صاحب اثری استاد جامعہ اسلامیہ گوجرانوالہ' اس پر ضرور روشنی ڈال کر اپنے قارئین کی تشفی فرما دیں گے۔ نیز یہ وضاحت بھی ہونی چاہیے کہ باچھوں سے متعلق بال کو **"شارب"** کہنے کے بعد ان بالوں کو کس نام سے پکارا جائے گا جو ونٹ کے اوپر نکل آتے ہیں؟ اگر ان کا نام بھی **شارب** ہی ہے تو آپ کی بعزاد تاویل کس کھاتے میں جائے گی؟

فاروق اعظمؓ کے شہپر

12۔ مذکورہ بالا تجزیہ کے بعد اب معروضی لہجہ میں گذارش کروں گا کہ دوسروں کا مبلغ علم جانچنے سے پہلے اپنے علم کے حدود اربعہ کا تعین بھی ضرور کرنا چاہیے کہ اس طرح انسان بہت سی نداموں سے بچ سکتا ہے!

یہ واہمہ کہ شہپروں کی مخالفت کی احادیث کی موجودگی میں فاروق اعظمؓ کے شہپروں کا وجود ہی ندارد تھا اپنے اندر کوئی اصلیت نہیں رکھتا۔ اہل حدیثوں اور محدثین کے سب سے بڑے پشتیباں علامہ حافظ ابن حجر مرحوم (1669ھ) فرماتے ہیں کہ:

وهو خطاء فان المعروف من عمر انه كان يوفر شاربه

"یعنی فاروق اعظمؓ کے شہپروں کا انکار غلط اور علمی خطا کو مستلزم ہے کیوں کہ یہ ایک مشہور حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ آپ لمبی مونچھیں (یوفر) رکھا کرتے تھے۔ (فتح الباری طبع سلفیہ مصر جلد دہم صفحہ 5/335 تا 6)

ابن حجر کے الفاظ میں "**یوفر**" پر **کان** کا حرف واقع ہوا ہے جو عمرؓ خطاب کی دائمی عادت کا غماز ہے کیوں کہ گرائمر کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ فعل مضارع پر جب کان کا حرف واقع ہو تو اس میں دوام اور استمرار کا مفہوم پیدا کر دیتا ہے۔ اس بنا پر "**کان یوفر**" کے معنی ہوں گے کہ فاروق اعظمؓ عمر بھر لمبی مونچھیں رکھنے کے عادی تھے۔ وهو المطلوب۔

ابن حجر ہی لکھتے ہیں کہ **وقد روى مالك عن زيد بن اسلم ان عمرؓ كان اذا غضب فتل شاربه فدل على انه كان يوفره**

"یعنی فاروق اعظمؓ جب خشمگین حالت میں ہوتے تو مونچھوں کو بٹنا اور تاؤ دینا جاری رکھتے جس سے واضح ہوتا ہے کہ (فدل) وہ لمبی ہوتی تھیں۔

(فتح الباری جلد 18/384/10 تا 19)

13۔ ابن حجر کا یہ تبصرہ ان لوگوں کا جواب فراہم کرتا ہے جو خود ایجاد

مفاہیم کے زور پر خود احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریف سے بھی باز نہیں آتے۔ ابن حجر نے اس بات کو حقیقت کے روپ میں پالیا تھا کہ فاروق اعظم ؓ کی لمبی مونچھیں (**یوفو**) حقیقت تھیں اور حقائق کا انکار وہی لوگ کرتے ہیں جو شعور و آگہی سے محروم' ضد اور ہٹ دھرمی کے اسلحہ سے لیس ہوتے ہیں!

مونچھیں کٹوانے پر شرعی تعزیر

اثری صاحب اور آپ کے ہم مسلک حضرات مونچھوں کے بارے میں کچھ زیادہ ہی پریشان معلوم ہوتے ہیں اور اسی پریشانی کا نتیجہ ہے کہ ان کا ایک گروہ مونچھوں کو زید بن ارقم کی روایت کی رو سے اخراج از اسلام کا باعث قرار دیتا ہے اور دوسرا انھیں حرام کہہ کر حکم دیتا ہے کہ انھیں بیخ وبن سے اکھیڑ پھینکنا چاہیے۔ جہاں تک سلف اکابر کا تعلق ہے تو امام مالک (رح) (795 م) اگر منکر حدیث نہیں تھے تو ان کا فتویٰ یہ تھا کہ:

"(داڑھی کی موجودگی میں (ط) مونچھوں کو جڑ سے اکھیڑ پھینکنا انسان کو (بندروں کی شکل کا بنا کر۔ ط) بد صورت بنا دیتا ہے۔ اس میں اور مثلہ کرنے میں کوئی فرق نہیں رہتا لہٰذا مونچھوں کو صاف کر کے بد صورت بنانے کے جرم میں ایسے شخص کو تعزیر دینا واجب ہے۔

14۔ **والیہ ذهب مالک و کان یری تادیب من حلقه وروی عنه ابن القاسم انه قال احفاء الشوارب مثلة**"

اور امام مالک کی طرح علماء کی اکثریت بھی یہی رائے رکھتی تھی

(تحفتہ الاحوزی طبع مصر جلد 8/42/5 تا 8)

اور باور کرنا چاہیے کہ امام مالک ؒ کے پیش نظر **من تشبه** اور **خالفو المشرکین** والی حدیثیں ضرور ہوں گی اس کے باوصف ان کے فتاوے اختلافی

زاویے ہی کو اجاگر کرتے ہیں۔

جنگ کے دوران شہپروں کی اجازت

ہمارے پاکستان میں امام اعظم ابو حنیفہؒ کی فکری قیادت کے پرستار زیادہ ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ ان کے اسلاف عقلیت پسند تھے اور عقل ہی کو مسائل کے فہم کا داخلی اور خارجی ذریعہ سمجھتے تھے — ان سے منقول ہے کہ یہ حضرات خاص مقاصد کے حصول کی خاطر مشرکین کی موافقت میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔ علامہ ابن دقیق العید (1302 م) احناف کے ایسے ہی گروہ سے روایت کرتے ہیں کہ

لاباس بابقاء الشوارب فی الحرب ارھا باللعدو

"یعنی دشمنوں کو مرعوب کرنے یا فریب دینے کی غرض سے جنگ کے دوران مونچھیں بڑھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ **(لاباس)**

بحوالہ فتح الباری جلد 10/ 348/19 تا 20)

15۔ احناف نے اگرچہ بلا تخصیص تمام لوگوں کے لئے جنگ کے دنوں میں مونچھیں بڑھانے کا مشورہ دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس ضرورت کو آرمی تک ہی محدود ہونا چاہیے میرا وجدان یہی کہتا ہے۔ ہاں تو میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ مونچھیں بڑھانا اگر قطعی حرام ہوتیں اور مونچھوں کا عادی نسائی کی حدیث کی رو سے امت اسلام میں سے نہیں رہتا تو کیا ایسا حرام یا کفر ایسے مقاصد کے لئے اختیار کرنا جو مونچھوں کے بغیر بھی حاصل ہو سکتے تھے' شریعت شکنی کی واضح نشاندہی نہیں کرتے؟ تو کیا حنفی بھی شریعت کے منکر تھے؟

ہونٹوں اور باچھوں کے بالوں میں فرق

تنقید نگار کا کہنا ہے کہ باچھوں کے دائیں بائیں جو بال ہوتے ہیں فاروق اعظمؓ

انھیں ہی بٹتے اور تاؤ دیتے تھے۔ اس کے جواب میں کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس صورت میں اوپر کے ہونٹ پر اگے ہوئے بالوں کا نام کیا ہو گا؟ کیوں کہ ہمارے نزدیک عربی کے شواہد یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہونٹ کے اوپر کے بالوں کو **شارب** اور اطراف کے بالوں کو **سبال یا سبل** (Sabal) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور یہ شارب لمبے ہو کر جب اطراف کے بالوں سے مل جاتے تو ان سب کو ملا کر بٹنا ممکن ہو جاتا تھا۔ یہ ایک نارمل قسم کی تشریح ہے' ناقد محترم اگر گوارا فرمالیں تو مفاہمت کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔ ورنہ تو حقیقت یہ ہے کہ سبال (Sabal) کا ہر قسم بڑھے ہوئے بالوں پر اطلاق ہوتا تھا۔ یہ باچھوں کے اطراف کے بالوں ہی سے خاص نہیں خود لمبی داڑھی پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے۔ علامہ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ

السبال بكسر المهملة وتخفيف الموحدة جمع سبلة بفتحتين وهى ماطال من شعراللحية فاشار جابر الى انهم يقصرون منها فى النسك

سبال داڑھی کے ان بالوں کو کہا جاتا ہے جو غیر ضروری حد تک بڑھے ہوئے ہوں جابر کی حدیث میں ایسے ہی بالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے واضح کیا گیا ہے کہ صحابہ کرام حج کے ایام میں کٹنگ کراتے تھے۔

(فتح الباری 350/10)

ہیوں کے بالوں کو بھی سبل کہا جا سکتا ہے۔ ابن حجر کی تشریح سے اس پر روشنی پڑ سکتی ہے۔

16۔ ہاں تو یہ استدلال واضح کرتا ہے کہ **سبل** کا باچھوں کے اطراف کے بالوں کی طرح داڑھی کے بالوں پر بھی اطلاق ہوتا تھا جس سے واضح ہوتا ہے کہ باچھوں کے اطراف کے بال حقیقت میں ریش ہی کے قبیلے کے بال تھے۔ مونچھوں کے خاندان سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا اس بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مونچھوں پر سبل کی تعریف ہرگز صادق نہیں آسکتی' خود ابن حجر کا شعور بھی اس

کی گواہی دیتا ہے کہ

موںچھوں کے بڑھے ہوئے بالوں کو اسی نسبت ہی سے **سبل** کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح ان کا بٹنا ممکن ہو جاتا تھا۔ (فتح الباری 10/349/25 تا 26)

17۔ یعنی ہر بٹی جانے والی چیز ابن حجر کے نزدیک سبل ہے۔ یہ داڑھی ہو خواہ باچھوں کے اطراف کے بال اس سے فرق نہیں پڑتا۔ ابن حجر یہاں اگرچہ اپنی بات میں زور پیدا نہیں کر سکے تاہم شارب کے بارے میں وہ بھی کسی خود ایجاد تاویل کے قائل نہیں تھے —— وہ اعتراف کرتے تھے کہ:

وماالشارب فهو الشعر النابت على الشفه العليا واختلف فى جانبيه وهما السبالان

"شارب ان ہی بالوں کو کہا جاتا ہے جو اوپر کے ہونٹ پر اگے ہوں۔ ہاں ان میں اختلاف ہے کہ باچھوں کے اطراف کے بالوں کو کیا کہا جائے گا؟ سو جہاں تک "ادبیات عرب" کا تعلق ہے تو انھیں شارب نہیں سبال سے موسوم کیا جائے گا۔
(فتح الباری جلد دہم صفحہ 340/24 تا 25)

علامہ عبدالرحمان الاخوزی جو اپنے زمانے کے مایہ ناز محقق ہو گذرے ہیں ان کی "تحقیق الکلام" جس موضوع سے تعلق رکھتی ہے تحقیق و ریسرچ میں سلف صالحین پر بھی سبقت لے گئی ہے وہ اگرچہ گروہی احساسات کے حامل تھے تاہم مونچھوں کی تعریف میں وہ بھی کسی تاویل اور تحریف کا سہارا نہیں لیتے —— فرماتے ہیں کہ:

والشوارب جمع الشارب والمرادبه الشعر النابت على الشفه العليا

یعنی شارب کی جمع شوارب ہے اس سے مراد وہ بال ہیں جو اوپر کے ہونٹ پر اگے ہوں۔ (تحفتہ الاحوذی طبع مصر 8/46/8)

18۔ حقیقت یہ ہے کہ سبل ان ہی بالوں کو کہا جاتا ہے جو طبعی طور پر نیچے کی طرف بڑھ رہے ہوں۔ مثلاً داڑھی، سر کے بال اور باچھوں کے اطراف کے

بال کہ ان کو کنگھی دے کر بھی اوپر کی جانب نہیں الٹایا جا سکتا لیکن شارب کا معاملہ قطعی مختلف ہے انھیں بٹتے وقت دائیں بائیں موڑا جا سکتا ہے وہ پرندے کی دم کی طرح نیچے کی طرف رخ کرنے کی بجائے سامنے کی طرف مقررہ سمت پر بڑھنا شروع کر دیتے ہیں کہ شہپر برادر انسان کا ہاتھ ہر وقت انھیں اپنے راستے پر چلنے کا اشارہ کرتا رہتا ہے وہ کہیں بھی اگر نافرمانی پر اتر آتے ہیں تو ان کا رکھوالا تاؤ دے کر ان کے مزاج کو درست کر لیتا ہے۔ بٹنے سے ان کے کس بل نکل جاتے ہیں اور وہ بغیر کسی دشواری کے اپنی ڈگر پر چلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ سدھائے ہوئے بال اس تربیت سے بے نیاز ہو کر خود رو گھاس کی طرح بے ہنگم طور پر نہیں بڑھتے جو ان کے رکھوالے کی طرف سے ان کو ملتی رہتی ہے۔

ان تشریحات سے ہونٹوں اور باچھوں کے اطراف کے بالوں میں جو فرق ہے آسانی سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ ناقد محترم نے اس فرق کو مٹا کر جس ڈھٹائی سے تاویل کا جامہ تراشا ہے اس کی رکاکت عیاں ہے۔

19۔ مجھے "سبل" سے کوئی غرض واسطہ نہیں ہے میرے استدلال کی بنیاد شارب کے لفظ پر ہے اور وہ آج بھی ہمہ قسم تحریف اور تاویل کے احتمال سے محفوظ ہے اگر کوئی مائی کا لال **شارب** کو **سبل** میں تبدیل کرنے کی جسارت کرے گا تو اسے گوجرانوالہ سے عربی کا ایک نیا لغت بھی وضع کرنا پڑے گا۔

یہ تھے وہ جوہری اسباب جن کی روشنی میں حدیث **خالفوا المشرکین** کا جائزہ لیا گیا تھا — ناقد محترم کو چاہیے کہ میری طرف بری نظر سے دیکھنے کی بجائے ان اسباب کی نفی کریں جو اس حدیث کی فنی تحلیل کا موجب بنے۔

داڑھی کترانے کا نبوی اشارہ

تنقید نگار نے میرے ہی حوالہ سے ذیل کا اقتباس سپرد قلم فرمایا ہے یعنی میں نے لکھا تھا کہ

"اس ضمن میں دو ایک حوالے مزید حاضر ہیں مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم لکھتے ہیں کہ:

كان النبى صلى الله عليه وسلم فى المسجد فدخل رجل ثائر الراس واللحية فاشار اليه النبى صلى الله عليه وسلم بيده كانه يأمر باصلاح شعره ولحيته ففعل ثم رجع فقال النبى صلى الله عليه وسلم اليس هذا خيرا من ان ياتى احدكم ثائر الراس كانه شيطان

اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے کہ ایک بے ہنگم ریش بالوں والا شخص حاضر ہوا اس کے آتے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی اور بالوں کی اصلاح کا حکم دے دیا' چنانچہ وہ حکم کی تعمیل بجالا کر پھر سے جب حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ریش و بالوں کی اصلاح بہتر ہے یا یوں بے ہنگم بال بڑھا کر شیطان بنے رہنا؟

یہ میرا اقتباس ہے لیکن تنقید نگار نے اس کے پیش کرنے میں پے در پے خیانتوں اور بد دیانتیوں کا ثبوت دیا ہے۔ پہلے تو اصل عربی عبارت کے بعد اس کا حوالہ اس طرح درج ہے۔

(کتاب اسلامی معاشیات کا ایک باب بحوالہ مجمع الفوائد بسند امام مالک نقل از معارف اعظم گڈھ جلد نمبر2 صفحہ 52)—— لیکن اسے حذف کر کے خبث باطنی کا مظاہرہ کیا گیا ہے کیوں کہ اس طرح قاری کو سوچنے کا موقع مل سکتا اور وہ آسانی سے کسی فریب کار کے جال میں نہیں پھنس سکتا تھا۔ دوسری خیانت یہ کی گئی کہ متعلقہ نصرت کا حوالہ نہیں دیا گیا تھا۔ اب اگر میں چاہتا تو اپنی بے حوالہ عبارت اور اقتباس کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیتا۔ لیکن میرے نزدیک خیانت کا جواب خیانت نہیں حقائق کا اعتراف ہے۔ تیسری خیانت ارادتاً یہ کی گئی کہ حوالے کی عبارت کا خلاصہ بیان کرنے کے ساتھ ہی میں نے سید سلیمان ندوی کے ان الفاظ کا اضافہ بھی کیا تھا کہ:

کانہ شیطان کے آخری الفاظ بہت زیادہ قابل توجہ ہیں ان کے لئے جنہیں اپنی ثائر الراس واللحیہ والی شکلوں پر ملکوتیت کا مغالطہ لگا ہوا ہے (معارف اعظم گڈھ نمبر2 جلد نمبر52 1943م)

لیکن خیانت پیشہ نے تبصرے کے ان الفاظ کو بھی حذف کر دیا۔

20۔ اس کے بعد ایک اور خیانت کی نشاندہی بھی کر دوں کہ میں نے اس حدیث کے پہلو میں فاروق اعظمؓ کی ذیل کی حدیث کو سامنے رکھ کر ہی اس کے الفاظ "**اصلاح شعر**" سے قینچی و بلیڈ کے استعمال کا اشارہ نوٹ کیا تھا لیکن اس حوالہ کو نوٹ نہ کر کے تنقید نگار نے جس بد دیانتی کا مظاہرہ کیا ہے وہ افسوسناک بھی ہے اور قابل مذمت بھی۔ لیجئے فاروق اعظمؓ کی معاون حدیث بھی ملاحظہ ہو۔

امام بدر الدین عینی (1351م) حنفی نے لکھا ہے کہ:

"**انہ (اے عمر) رای رجلاقد ترک لحیتہ حتی کبرت فاخذیجذ بھا ثم قال ایتونی بجملتین ثم امر رجلافجز تحت یدہ (فقال بعدہ) یترک احدکم نفسہ کانہ سبع من السباع**

یعنی — عمر خطاب نے ایک دراز ریش کی داڑھی پکڑ کر کھڑا کر دیا اور قینچی لانے کا حکم دے دیا — قینچی لے کر آنے کی دیر تک داڑھی کو پورے زور سے پکڑے رکھا — اس کے بعد قینچی لانے والے کو حکم دے دیا کہ بڑھے ہوئے بال کتر ڈالے۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ تمہارا یوں درندے بن کر رہنا اچھا لگتا ہے؟ (بحوالہ عینی شرح بخاری جلد دہم ص 285 بحوالہ معارف اعظم گڈھ فروری 1943)

21۔ یہ حدیث اپنے مفہوم میں واضح اور سابقہ حدیث کی وضاحت کے لئے سنگ میل کا کام دے رہی ہے اور میں نے سابقہ حدیث کے لفظ "اصلاح شعر" کا مفہوم واضح کرنے کے لئے اس ہی سے تشریح کا کام لیا تھا مگر ناقد محترم نے جہاں اسے حذف کر کے بددیانتی کا مظاہرہ کیا وہاں میرے اخذ کردہ مفہوم کو

تحریف کا نام بھی دے ڈالا۔

22۔ یہاں خیانت کی آخری نشاندہی نیز ملاحظہ ہو کہ محترم موصوف نے صریح غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے میرے اس اقتباس کو عنوان "داڑھی نہ کترنے والے قابل ستائش نہیں" کی بجائے دوسرے عنوان "داڑھی سنت؟" کی ذیل میں درج کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ:

مقالہ نگار نے یہ حدیث سمجھنے میں بالکل تکلیف گوارا نہیں کی۔ اور یہ روایت داڑھی کی عدم سنت پر پیش کی ہے (اہلحدیث 6.4.73 صفحہ 6 کالم 1)

23۔ میں نے حدیث کو سمجھا یا سمجھنے کی صلاحیت سے محروم رہا ہوں اسے میں نے اپنے فہم کے مطابق داڑھی نہ کترنے والے قابل ستائش نہیں کے عنوان سے ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو نصرت 21 مئی 73 لاہور) لہٰذا آپ جس مقصد کو لے کر میرے منشاء کو غلط رنگ دے رہے ہیں وہ پورا ہوتا ہوا نظر نہیں آرہا۔

بالوں کی اصلاح سے کیا مراد ہے؟

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بے ہنگم ریش و بالوں والے جس شخص کو "**اصلاح شعر**" کا حکم دیا تھا اس کا حقیقی منشاء کیا تھا؟ ناقد محترم کہتے ہیں **اصلاح شعر** سے تیل ڈالنا اور کنگھی کرنا مراد ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اصلاح یعنی درستگی اور سنوارنے کا حکم فرمایا۔۔۔ مقالہ نگار اس حدیث میں کہیں بھی یہ نہیں دکھا سکتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صحابی کو داڑھی کٹوانے کا حکم دیا ہو۔

بلکہ اس حدیث کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ قینچی وغیرہ سے بال درست کر لیا کرو ویسے ہی بکھرے رہنے نہ دیا کرو (اہلحدیث 6 اپریل 72' لاہور صفحہ 9 کالم 1'2)

24۔ اس کے برعکس راقم الحروف نے فاروق اعظم کی معاون حدیث کی ضوء میں **اصلاح شعر** سے کتنگ مراد لے کر اپنا مفہوم واضح کیا تھا اور مجھے

اصرار ہے کہ میں کسی غلط نتیجہ پر نہیں پہنچا— کنگھی تیل کے لئے **تسریح شعر** کا لفظ استعمال ہوا ہے "**تصحیح شعر**" کا کہیں بھی نہیں ہوا' تنقید نگار اس حدیث میں کہیں بھی یہ نہیں دکھا سکتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صحابی کو کنگھی پٹی کا حکم دے دیا تھا۔

نہ خنجر اٹھے گا نہ تلوار ان سے

یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں

بلکہ اس حدیث کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ قینچی وغیرہ سے بال کترواکر درست کر لیا کرو' ایسے ہی بڑھنے نہ دیا کرو۔

25۔ معلوم ہوتا ہے کہ تنقید نگار کو بعض شارحین احادیث کی باب بندی سے دھوکہ لگا ہے اور وہ الفاظ کو طبعزاد معانی کا جامہ پہنا کر امید رکھتے ہیں کہ دوسرے بھی ان کے اجتہاد اور فلسفے کی پیروی کریں۔ لیکن انسان جب تک اللہ کے عطا کردہ شعور و آگہی سے بہرہ ور ہے اسے کسی کے ذاتی فلسفے اور مسلک کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ انسان دلیل و منطق کے سامنے تو سر تسلیم خم کر سکتا ہے— مفروضات اور ملی بھگت سے متعین کردہ مفاہیم اور معانی کے تسلیم کرنے پر مامور نہیں ہے عربی میں ص ل ح (S.L.H) اور س ر ح (S.R.H) کے مادے جداگانہ مفاہیم کی غمازی کرتے ہیں۔ اہل زبان نے کنگھی دے کر بال سنوارنے کے مفہوم میں **سرح' مشط** اور **فرجل** کے الفاظ کو خاص کیا ہے ان کے محاورات میں کہیں بھی واضح نہیں ہوا کہ "**صلح**" کا لفظ بھی ایسا مفہوم دے سکتا ہے۔ امام زمخشری (1144م) لکھتے ہیں کہ **وسرحت شعرھا مشطت** — اس نے کنگھی دے کر بالوں کو سنوار لیا — (اساس البلاغہ طبع محمد ندیم قاہرہ بذریعہ فوٹو آفسٹ ص 208 کالم نمبر1) **منجد اللغۃ** میں بھی ایسے ہی معنے دیئے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو **المنجند** طبع بیروت ص 339 کالم نمبر2— القاموس العربی میں لکھا ہے **سرح الشعر مشطہ**

(To Comb Hair) (القاموس الجامعی طبع قاہرہ، صفحہ 302 کالم نمبر 1)

26۔ ان تمام لغت نویسوں نے کنگھی دے کر بال سنوارنے کے مفہوم کے لئے "**اصلاحِ شعر**" کا لفظ کہیں بھی استعمال نہیں کیا سب نے "**تسریح شعر**" ہی کو اس کے لئے خاص کیا ہے۔ اس کے باوصف اگر ان کا اصرار ہے کہ داڑھی بڑھانے والی احادیث کے عمومی لہجہ کے احترام میں کٹوانے کی بہ نسبت "**اصلاح شعر**" کے معنی کنگھی کرنا ہی موزوں رہیں گے تو اس صورت میں بھی ان کو پوری طرح اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکتی کہ اس طرح **اصلاح شعر** کا لفظ دو مختلف معانی میں مشترک تصور کر لیا جائے گا اور مشترک المفہوم تصور کر لینے کے بعد کسی فریق کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے جی سے جس مفہوم کو چاہے متعین کر دے؟

27۔ یہ درست ہے کہ اپنے اپنے طور پر اصلاح کا لفظ ہو یا تسریح کا درجنوں معانی میں مستعمل ہوئے ہیں اور قرائن سے ہر معانی کو اپنے محل میں متعین کرنا کچھ دشوار بھی نہیں ہو سکتا لیکن کیا وجہ ہے کہ **اصلاح شعر** کا لفظ اپنے درجنوں معانی کے باوصف کہیں بھی کنگھی دینے کے مفہوم میں استعمال نہیں ہوا نہ قرائن سے نہ اشاروں سے۔ پھر جدید عربی کو دیکھئے تو اس میں بھی **تصلیح الشعر** (اصلاح گیسو) کے الفاظ کٹنگ ہی کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ میں نے لبنان، عراق اور شام کی بہت سی ہیئر کٹنگ سیلونوں کے بورڈ دیکھے ان پر "**تصلیح الشعر**" کا لفظ کٹنگ ہی کے مفہوم میں لکھا ہوا پایا اور میں نہیں کہہ سکتا۔۔۔ کہ میرا مشاہدہ حرف آخر اور نتیجہ خیز ہے تاہم میرا ایمان ہے کہ جدید مفہوم کو قدیم معنوں سے کلی طور پر الگ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

28۔ قدیم میں اگر **شعر** (Hair) کے قرینے سے اصلاح کا لفظ کٹنگ پر دلالت کرتا ہے تو جدید میں اسی ہی مناسبت کو ملحوظ رکھ کر کٹنگ ہی کے معنے کو ترجیح دی جائے گی اور میں نہیں کہہ سکتا کہ آج کا اہل زبان کل کے اہل زبان کے برعکس **تصیلح اشعر** کے اشتہار سے کنگھی تیل ڈلوانے کا مرکز مراد لے

کر اس غرض سے اصالون الحلاقہ (ہیئر کٹنگ سیلون) میں داخل ہو کر باربر کی کرسی پر ٹانگیں دراز کر لے گا کہ اس کی داڑھی اور سر کے بالوں میں تیل ڈال کر کنگھی کر دی جائے گی۔

29۔ یہاں تک تو حدیث **خالفو المشرکین** کے ایک فقرے **احفوا الشوارب** (مونچھیں صاف چٹ کرا لو) کی فنی تحلیل کر کے اس کے ایک پہلو کو ناتواں اور کمزور بنا کر دکھایا گیا ہے۔ زیادہ وضاحت کے لئے اصل مقالہ دیکھا جا سکتا ہے۔ اب اس کے دوسرے فقرے **واعفو اللحی** (داڑھی بڑھا لو) کے لئے اصل مقالے کے علاوہ دیگر معروضات حاضر کر رہا ہوں۔

داڑھی مخلوط ثقافت کی علامت تھی!

میں نے اپنے اصل مقالے میں **واعفو اللحی** کے فقرے کی بابت عرض کیا تھا کہ اس کا مفہوم واضح نہیں ہے کہ خود مشرکین مکہ بلکہ ان کے سرخیل ابوجہل کے بھی داڑھی تھی۔ پس مشرکین سے داڑھی رکھ کر جو مخالفت مطلوب ہونی چاہیے وہ پوری نہیں ہو سکتی—— وہاں ضمناً یہ گذارش بھی کر دی گئی تھی کہ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو کسی دینی عقیدے کی بناء پر نہیں بلکہ سیاسی یا کسی دوسری مصلحت کے پیش نظر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا مشورہ ارزاں فرمایا ہو گا—— خاص کر داڑھی اس معنے میں کیسے سنت ہو سکتی ہے جبکہ ہزار ہا سال پہلے سے مختلف اقوام کے تمدن کا حصہ رہ چکی ہو؟ اسے سنت سے زیادہ تہذیبی اثر کہا جائے تو زیادہ موزوں ہو گا وغیرہ وغیرہ۔

30۔ یہ حقیر گذارش ہمارے تنقید نگار کو ناگوار گزری اور اس گذارش کے ہمراہ وضاحتوں کو شامل کیا گیا تھا انھیں بھی غیر کافی سمجھ کر فرمایا گیا کہ ہم اسلام کی حدود سے ادھر ادھر ہو گئے ہیں۔ وغیرہ۔

غور فرمائیے میں نے کسی بھی طرح داڑھی کی نفی نہیں کی صرف یہی وضاحت

مانگی تھی کہ داڑھی کو بایں معنے "سنت نبوی" تسلیم کرنا کہ اس کا آغاز بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہوا تھا تو یہ بات دلیل و منطق سے کوئی ہم آہنگی نہیں رکھتی بلکہ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے اس پر رسمی طور پر سنت کا اطلاق نہ کر کے ان لوگوں کے "عقیدت" کے گھروندوں کو پیوند زمین کر دیا ہے جو نہ صرف اسے "**سنن ہدیٰ**" میں شمار کرتے تھے اس کی فرضیت کے قائل بھی تھے۔ غور فرمایئے نکاح جس کا بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہزاروں برس پہلے بھی رواج تھا یعنی دو اجنبی نر و مادہ کو چند بے معنی کلمات جپ کر حلال کرنے کے لئے ایران کے "موبد" مصر کے "کاہن" روم کے "پادری" ہند کے "پنڈت" یہود کے "ربی" اور وحشی افریقہ کے جنگلیوں کے "دیوتا" رسماً کچھ مبہم الفاظ دہراتے تھے' اسے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لئے سنت قرار دے کر تجرد اور رہبانیت کے ممکنہ رجحان کو روکنے کی سبیل نکال لی لیکن داڑھی جس کے بارے میں علمائے امت کے جذبات نہایت ہی نازک رہتے ہیں اس کی اہمیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اتنی بھی نہ ہو کہ اپنی زبان مبارک سے اس پر سنت کا اطلاق ہی کر لیں؟ بسا اوقات انسان دوسرے کے عمل کو اپنا کہہ کر اپنے ماننے والوں سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اس پر کاربند ہونے میں پس و پیش نہیں کریں گے ــــ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی کے بارے میں اس نفسیاتی اصول کو بھی استعمال نہیں کیا۔ کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اندیشہ تھا کہ اس طرح لوگ ایمان کے بارے میں "رہنما اصولوں" کو چھوڑ کر رسمی اصولوں کو حقیقت سمجھ لیں گے۔ وہ ظواہر پرستی کو تو شیوا بنا لیں گے مگر روح اور حقیقت سے گریزاں رہیں گے۔

31۔ اس تناظر میں یہ بات حیرت انگیز ہے کہ۔ **النکاح من سنتی** فرما کر آپ نے قدیم رسم کا نہ صرف اپنی سنت کی حیثیت سے تعارف کرایا بلکہ یہ تنبیہہ بھی فرمائی کہ ــــ **فمن رغب عن سنتی فلیس منی** ــــ جس

نے میری سنت (نکاح) سے "عمداً" گریز کیا' وہ میری اُمت کے قابل نہیں رہا۔"
لیکن داڑھی کے بارے میں اس قسم کے شدید لہجے میں آپ ﷺ نے کہیں بھی اظہار نہیں فرمایا— شدید کیا نرم لہجے میں بھی آپ نے اسے سنت نہیں ٹھہرایا۔ کیوں آپ ﷺ فطرت اور تہذیب کے مابین کھلے فرق کو مٹانا نہیں چاہتے تھے۔ شادی کا تعلق فطری امور اور انسان کی جبلی خواہشات سے تھا' لہٰذا اس کے بارے میں آپ ﷺ نے زیادہ سے زیادہ تاکیدی زبان میں بات کی لیکن داڑھی کی ویسی حیثیت نہیں تھی۔ اس کا طبعی تقاضوں اور فطری خواہشات سے کوئی تعلق نہیں تھا لہٰذا آپ ﷺ نے اس کے متعلق کسی طرح کا شدید نوٹس نہیں لیا تو کیا یہ حقائق نہیں کہ — داڑھی کی خاطر اخراج از اسلام کا اہتمام غیر ضروری محاذ آرائی اور فرضی خوبیوں و فضائل کی تبلیغ اپنے اندر کوئی وزن اور روشنی نہیں رکھتی— لہٰذا ہمارے نزدیک داڑھی (کو عمدہ خصلت مان لینے کے باوجود) خالصتاً تہذیبی چیز ہے۔ سرسید مرحوم کے دور میں داڑھی کو عظمت اور وقار کی علامت اگر سمجھا جاتا تھا تو آپ کی طرح سرسوتی دیانند اور سر ولیم میور بھی داڑھی رکھتے تھے بلکہ لاہور کے مقبرہ انار کلی کے ہال میں غیر مسلم فرماں روایان ہند کی تصاویر کو ملاحظہ کیجئے تو محسوس ہو گا کہ درجنوں غیر مسلم فرماں روا باریش ہی تھے— پس جو خصوصیت اور امتیاز داڑھی کو ہمارے ہاں حاصل ہے اس کی برتری کی کچھ اصلیت نظر نہیں آتی۔ داڑھی اس زاویئے سے خالص تہذیبی اور تمدنی چیز ہے اور بدلتے تمدن کے ساتھ اس کی پوزیشن بھی بدلتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بالغ نظر فقہانے اس حقیقت کا اعتراف کر لیا تھا کہ "**تجدد الحکم بتجدد العادۃ**" "یعنی تمدن اور عادت سے تعلق رکھنے والے احکام کے بارے میں اسلام کی پالیسی یہ ہے کہ ان کا حکم بھی تمدن اور عادت کی طرح بدلتا اور تازہ بہ تازہ صورت اختیار کرتا رہے گا۔

32۔ مصری تہذیب و تمدن اور آثار قدیمہ کے ماہر (Archiologist) ڈاکٹر حسن کمال مرحوم نے فراعنہ کے نقوش' آثار

اور حفریات (کھدائی) سے برآمد شدہ مورتیوں' لمبی لمبی دیواری سلوں اور نقوش کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ داڑھی اور سر کے بال خالص تہذیبی مظاہر تھے' ہیں اور رہیں گے۔ وہ یونانی مورخ ہیروڈوٹس (425 ق م)(Herodote) کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

مصر کے شہری قانون کی رو سے بچوں اور مردوں کے لئے سر کے بال صاف کرنا ضروری تھے۔ شاذو نادر ہی کسی کو مستثنیٰ کیا جاتا تھا اور جو سربراہان مملکت یا اسی ہی کلاس کے لوگ ہوتے وہ خاص رسوم کی بجا آوری کے لئے خاص محافل میں مصنوعی بال (**الشعور العاریه**) سر پر رکھتے تھے۔ رومن امپائر کے ججوں کے لئے جو مصنوعی بال استعمال کئے جاتے تھے وہ بھی انہی مصری فراعنہ کی عادات ہی سے متاثر تھے۔

(المقتطف طبع نومبر 1935ء ص 435 قاہرہ)

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں کہ:

مصر کے اس قانون کا اطلاق ہر فرد پر ہوتا تھا۔ ان کے نزدیک سر کے بالوں کی طرح داڑھی اور مونچھوں کے بال بھی قطعی طور پر معیوب اور قبیح محسوس کئے جاتے تھے۔ تورات کے سفر تکوین میں یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں اشارہ موجود ہے کہ جیل سے رہائی کے بعد آپ جب فرعون مصر کے دربار میں تشریف لائے تو اسی مصری قانون کی پابندی کے بعد ہی ملاقات ممکن ہو سکی۔ مصریوں کے ہاں داڑھی اور مونچھوں کے حاملین سے نفرت اور بیزاری کا شعور اس حد تک شدت اختیار کر گیا تھا کہ

اذا ارادوا ان یحقروا شخصا رسموه بلحیة و شارب

"وہ جب کسی کی تحقیر کرتے تو داڑھی اور مونچھوں کے ساتھ اس کی تصویر بنا لیتے

(المقتطف صفحہ 435/15)

یہ مصری یونانیوں کا ذبیحہ اس بنا پر کھانے سے پرہیز کرتے کہ ان دنوں داڑھی ان کے تمدن کا حصہ تھی۔ (صفحہ 435)

33۔ ایک بار رمیسس ہفتم سے مصریوں کی منشاء کے خلاف کوئی امر سرزد

ہوا تو مصریوں نے برہمی اور حقارت کے اظہار کے بطور اس کا داڑھی والا مجسمہ بنا ڈالا (ایضاً ص 435)

یہ تو تھا مصریوں کا داڑھی کے بارے میں عام تاثر' لیکن ایسا بھی ہوا کہ ایک بار یہی داڑھی ایک خاص حادثے کے باعث قابل نفرت نہیں رہی یعنی ہوا یہ کہ رمیسس دوم کافی دنوں تک حالت جنگ میں رہا اور اسے حجامت بنوانے کی فرصت نہ مل سکی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی داڑھی بڑھ گئی۔ مصریوں نے اس کی مجبوری پر برا منانے کی بجائے یہی محسوس کیا کہ فرعون مذکورہ جنگ سے متعلق امور میں منہمک رہنے کی وجہ سے اتنا وقت ہی نہ پا سکا کہ داڑھی صاف کرا سکے چنانچہ انہوں نے اس خاص معاملہ میں ان سے رعایت برتی اور بعد میں ان کا مجسمہ تراش لیا گیا تو اس کی داڑھی کا نشان بھی باقی رکھا گیا۔ لیکن مجسمہ کی ساخت میں اس پہلو کو زیادہ تر ملحوظ رکھا گیا کہ اسے حالت جنگ ہی میں دکھلایا گیا (ص 435) کیوں کہ اس کے بغیر نارمل حالت میں داڑھی والا مجسمہ نہیں بنایا جا سکتا تھا۔

34۔ **ھکسوس** خاندان کے زمانے میں داڑھی قطعی طور پر خلاف قانون تھی بلکہ کاہنوں کے حکم سے جسم کے تمام بال صاف کئے جاتے تھے۔ ڈاکٹر حسن کمال لکھتے ہیں کہ

جاء عن یوسف علیہ السلام انہ طلب من اخوتہ ان یحلقو الحاھم و ینظفوا اجسامھم وقت استحضارھم والدھم لمصر مراعاۃ لعادات المصرین واحترامالھا

یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا کہ وہ جب ان کے والد (یعقوب علیہ السلام) کو مصر میں لے آئیں تو مصریوں کی عادات اور ضابطوں کے احترام میں داڑھی منڈا کر جسموں کو نہا دھو کر صاف ستھرے شہر میں داخل ہوں۔

(المقتطف ص 435/ 20 تا 21)

35۔ مصری عادات نے رومیوں پر بھی گہرے اثرات چھوڑے تھے کہ بعد

میں رفتہ رفتہ وہ بھی ان کی ریش تراشی کے گرویدہ ہوتے چلے گئے۔ رومی ایمپائر کے ایک دور میں امرد لڑکوں کو جونہی پہلے پہل داڑھی نکل آتی۔ مُنڈا کر دیوتاؤں کی نذر کی جاتی۔ یہ گویا اس بات کی علامت ہوتی تھی کہ ایسے لڑکے جوانی کی حدود میں قدم رکھ چکے ہیں۔ (ایضاً صفحہ 435)

36۔ مصر میں خاص محافل میں شرکت کے لئے داڑھی کی صنعت سے استفادہ کرنے کی محدود اجازت بھی ہوتی تھی لیکن مراعات یافتہ طبقے کسی طرح بھی اصلی داڑھی کے ہرگز مجاز نہ ہوتے تھے انھیں مصنوعی داڑھیاں (**الحاھم المستعارہ**) ہی استعمال کرنے کی اجازت تھی۔ ڈاکٹر حسن کمال لکھتے ہیں کہ:

و یمتاز سراۃ القوم بلحاھم المستعارۃ ذات الاشکال المخصوصۃ وکان افراد الطبقۃ الوسطی یتزیتون بلحی مستعارۃ لایذید طولھا علی خمسۃ سنتیمیترات ولحی الملوک المستعارۃ طویلۃ و ذات زوایا مستقیمۃ ولحی المعبودات' ملتویۃ الطرف السفلی۔

"یعنی قوم کے اونچے طبقے کے لوگ مخصوص محافل میں شرکت کے لئے مختلف ڈیزائنوں (اشکال) کی داڑھیاں لگاتے تھے۔ ان میں سے درمیانے طبقے کے لوگوں کی مصنوعی داڑھیوں (**لحی مستعارہ**) کی لمبائی پانچ سینٹی میٹر سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ اسی طرح فراعنہ کی داڑھیاں بھی امتیازی حیثیت رکھتی تھیں کہ وہ طویل بھی ہوتیں اور ان کے زاویے بھی مستقیم ہوتے اور جو کاہن ہوتے ان کی داڑھیاں لمبی اور گھنگریالی بنائی جاتیں۔ (صفحہ 435 / 26 تا 28)

37۔ ماہرین اثریات کی ان نادر تحقیقات کی روشنی میں داڑھی سراپا ایک "تہذیبی اثر" بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اسی حیثیت سے اس کا اعتراف کیا اور اسی ہی اعتراف کی حدود میں اسے باقی رہنے دیا۔ اس نے کہیں بھی دینی عقیدے کی حیثیت سے بالوں کو ایمان اور اسلام کا جزو قرار نہیں دیا اور

جن احادیث کو بہ تکلف اس مقصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے— ان میں رہنما اصول بننے کی صلاحیت نہیں ہے— خاص کر ایمان اور اسلام کو افعال قلب سے وابستہ کر کے تمام تر ذمہ داری "قلب" پر ہی عائد کر دی گئی ہے۔ داڑھی والے اسلام کی اس اٹل حقیقت کو نہیں بدل سکتے۔ نبی الاسلام ﷺ نے بالکل سچ فرمایا ہے کہ:

"اللہ سبحانہ تمہاری شکلوں اور اعمال کو نہیں دیکھتے اس کی نظر تمہارے قلب پر ہے کہ وہ سلیم ہے یا سرکش؟ ایمان کا ظرف بنا ہے کفر کا گھر؟

"ان اللّٰہ لا ینظر الی صورکم ولا الی اعمالکم

و لکن ینظر الی قلوبکم (صحیح مسلم)

داڑھی کے تہذیبی اثر ہونے پر رسول اللہ کی گواہی

ناقد محترم نے اپنی ہی تحریر میں اعتراف کیا ہے کہ بالوں کا معاملہ اقوام کی تہذیب و تمدن سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ طبرانی' بیہقی' مجمع الزوائد اور فتح الباری کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لمبی مونچھیں اور داڑھی صاف رکھنا مجوسیوں کی تہذیب میں شامل ہے۔

(خلاصہ از اہلحدیث 16 مارچ 1973ء صفحہ 70 کالم 1)

38۔ اس فرمان میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی اور مونچھ کے تہذیبی اثر ہونے کا اعتراف فرمایا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی اعتراف کو ملحوظ رکھ کر ہی شرف الدین نوری (1277م) کو کہنا پڑا کہ:

وکان من عادہ الفرس قص اللحیہ فنھی الشارع عنہ

"داڑھی کترانا ایرانیوں کی عادت اور تہذیب سے متعلق ہے۔

(خلاصہ از اہلحدیث 16 مارچ 1973ء)

ادھر ہمارے شاہ ولی اللہ نے بھی ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی کچھ

سمجھا کہ داڑھی کٹانا مجوسی تہذیب کا حصہ ہے۔ **فقصها سنة المجوس**

(حجتہ اللہ البالغہ بحوالہ الحدیث مذکور)

39۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ داڑھی کترانا اگر ایرانیوں کا تہذیبی ورثہ تھا اور عجمی ہی اس کے عادی و خوگر تھے تو اس کی وضاحت بھی ہونی چاہیے کہ ظہور اسلام کے وقت سامی قبائل (براہیمی و اسرائیلی نسل) کی داڑھیوں کا کیا حال تھا؟ تو یہاں تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ فل داڑھی رکھنا ان ہی کا تہذیبی اور ثقافتی نشان تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ براہیمی نسل سے زیادہ میل رکھتے تھے لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سامیوں کے اس تہذیبی اور ثقافتی نشان کو گوارا کر لیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایرانی غیر مسلموں کی تہذیب کی نسبت یہودی غیر مسلموں کی تہذیب کو اپنانے کا مشورہ دے کر اصل میں اس نفرت کا اظہار فرمایا تھا جو ایرانی سامراجیوں کے خلاف جزیرۃ العرب میں موجود تھی— اور نظر بحالات موجودہ ایسا مشورہ مستقبل کی سیاست اور ابھرنے والے نئے انقلاب کے لئے ضروری تھا— کیوں کہ اس وقت ایرانی ایک استعماری قوت کے روپ میں ابھر کر عرب اور مشرق اوسط کو اپنی گرفت میں لے چکے تھے اور لوگ نفرت کے باوجود ان کے سامنے دم مارنے کی مجال نہیں رکھتے تھے۔ ایسے میں پیغمبر انقلاب نے جب مٹھی بھر انسانوں کو روح معنویت سے لیس کر کے باطل سامراج کو للکارا تو ریش بردار سامی غلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہونا شروع ہو گئے۔ آپ نے ان کی مزید دلجوئی کے لئے بہ حالات موجودہ یہی مناسب سمجھا اور سامراجیوں کی تہذیب اور ثقافت کے مقابلے میں سامیوں کی تہذیب سے ہم آہنگی کو ترجیح دی اس کا سیاسی فائدہ یہ ہوا کہ عرب ایرانی بدیشیوں کے خلاف صف آراء ہو گئے اور چند ہی برسوں میں عجمیوں کی غلامی کا طوق اتار کر پھینک دیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اقدام نبوت اور سیاسی بصیرت کے عین مطابق تھا۔ اس وقت اسلام کی مصلحت اسی میں تھی کہ ہمسایہ تہذیب کو بدیشی

تہذیب پر ترجیح دی جائے۔ یہاں اگر بدیشی ثقافت کی مخالفت کی تہ میں کوئی دینی اصول کارفرما ہوتا تو ضروری تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قومی تشخص کی اساس کسی تہذیب و تمدن پر رکھتے لیکن قرآن گواہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا۔

داڑھی کے اثبات پر ایک مفلوج استدلال

ناقد محترم نے **المنتقی**، طبرانی، بیہقی، تاریخ البخاری اور مسند احمد کے حوالے سے کسریٰ کے ان دو ایلچیوں کا واقعہ لکھا ہے جو ریش تراش اور شہپر بردار تھے کہ ان لوگوں سے نفرت کے انداز میں آپؐ نے فرمایا کہ:

تمہیں کس نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے؟ انہوں نے کہا ہمارے رب (کسریٰ) نے ایسا حکم دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے رب نے مجھے داڑھی بڑھانے کا حکم دیا ہے۔ (بحوالہ اہلحدیث 16 مارچ صفحہ 10 کالم نمبر2 بطور خلاصہ)

یہ واقعہ تین ذرائع سے طبری (923م) نے بھی اپنی شہرہ آفاق کتاب **الامم والملوک** میں درج کیا ہے۔

40۔ اس واقعہ کا اگر محدثین کے طریقے پر جائزہ لیا جائے تو اس کی سندیں مجروح اور متن مضطرب ہیں — اور ہماری تنگ دامانی اجازت نہیں دیتی کہ غیر معیاری کتابوں کے ایک حوالے کو تنقید اور جرح کے لئے خاص کریں۔

41۔ اس واقعہ سے ناقدین کا یہ استدلال کہ داڑھی رکھنا پیغمبر کا ذاتی فعل ہی نہیں تھا حکم یزداں سے اس کا رکھنا فرض بھی تھا۔ سراسر غلط استدلال ہے۔ اہلحدیثوں نے داڑھی کی بابت اپنے پمفلٹوں اور کتابوں میں جس بدہضمی سے اس واقعہ کو ذکر کیا ہے اس سے ان کے دینی اور سیاسی شعور سے بانجھ ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ واقعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور کردار کو داغدار بنا رہا ہے — ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ نبی الاسلام ﷺ سیاست کی

نفسیات سے نابلد ہو کر سفارتی آداب کو پس پشت ڈال دیں اور کسی سربراہ مملکت کے سفراء کے ساتھ داڑھی کے معاملہ میں الجھ پڑیں؟

42۔ یہ واقعہ متن کے اضطراب کے باعث نہ صرف کمزور ہے جعلی اور وضعی بھی معلوم ہوتا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ سفیروں نے دربار نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر سلام عرض کیا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ پھیر لیا۔ انہوں نے دوسری طرف سے آکر سلام کیا تو اب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے رخی ہی کا مظاہرہ کیا۔ اس پر انہوں نے وجہ بے التفاتی دریافت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تم کیا شکلیں لے آتے ہو' داڑھی کا تو نام و نشان ندارد ہے مگر مونچھیں بڑھا کر آئے ہو۔ اس کے جواب میں انہوں نے اپنے بادشاہ کی تابعداری کا حوالہ دے کر معاملہ کو رفع دفع کرنا چاہا۔ مگر آپ نے اس کی نفی کرتے ہوئے فرمایا کہ نہیں میرے رب نے مجھے داڑھی بڑھانے اور مونچھیں کٹوانے کا حکم دیا ہے وغیرہ۔ اس کے بعد راوی کہتے ہیں کہ آپؑ نے ان سے کوئی بات نہیں کی اور مجلس سے نکال دیا— وغیرہ غور فرمایئے بدتمیزی کے اس شاہکار کو منسوب کیا جا رہا ہے۔ سب سے بڑے معلم اخلاق اور نفسیات بشر کے سب سے بڑے واقف کار کی طرف؟ صلی اللہ علیہ وسلم۔

43۔ یہ لوگ رسول اعظم کو بالکل ہی اپنی طرح کے کٹر مذہبی انسان کے روپ میں پیش کر کے دنیا سے امید رکھتے ہیں کہ وہ بھی ان کے فہم کے مطابق رسالت کا مقام سمجھنے کی کوشش کریں؟ قرآن پاک تو زندگی کے طولانی سفر کے آداب سکھلاتے ہوئے آپ کو لائن دیدے کہ

لَوْكُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ

"اے کائنات بشری کے رہبر اعظم اگر آپ سخت گیر اور سخت دل ہوتے تو تمہارے گرد اکٹھے ہونے والے منتشر ہو جاتے۔ (عمران 159)

اس آیت میں آپ کے سخت گیر اور درشت مزاج ہونے کی قطعی نفی کرتے ہوئے واضح فرمایا گیا ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو سب سے پہلے مزاج نبوت کو سمجھنے

والے بھی دوڑ جاتے۔

44۔ لیکن اس کے برعکس اپنے زعم میں تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھنے کا صحیح فہم رکھنے والے مدعی ہمیں یہ باور کرا رہے ہیں کہ صرف بے ریش ہونے کے جرم ہی میں آپ نے غیر ملکی سفیروں کو بے عزتی سے نکال دیا — یا ان کے سلام کا جواب نہیں دیا تھا؟ العیاذ باللہ

45۔ کیا یہ ممکن ہے کہ مشرکانہ رسوم کے حامل کسی نووارد کی عادات و تہذیب کو موضوع بنا کر نبی الاسلامؐ نفرت و حقارت کا غیر ضروری حد تک اظہار کر بیٹھیں؟ آپ تو قرآن کی گواہی کے بموجب خلق عظیم کے مالک تھے۔ (ن' 40) آپ صلی اللہ علیہ وسلم منافی اخلاق حرکت کیسے کر سکتے تھے؟ یہ علاوہ اس کے کہ نبی کا وجدان اتنا پختہ اور عقل اتنی رسا ہوتی ہے کہ اس کے کلام میں غلطی یا غلطی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ اظہار مدعا کے لئے جو بھی اسلوب اختیار کر لیتا ہے حقیقت اور سچائی کا مظہر ہوتا ہے۔ وہ ایک سامی عادات کے احیاء کے لئے یہ نہیں کر سکتا کہ

ولکن ربی امرنی باعفاء لحیتی و قص شاربی۔

"مجھے تو میرے رب نے داڑھی رکھنے اور مونچھیں کٹوانے کا حکم دیا ہے۔"

46۔ یہ ایک غلط بیانی ہے رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی توقع نہ رکھنی چاہیے کہ اس طرح یہ سوال سطحی ذہن پر ضرور ابھرے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس حکم رب کا حوالہ دیا ہے وہ حکم کس پارے' کس رکوع یا کس آیت اور کس سورت میں ہے؟

کیوں کہ ایسا حکم اگر رب ہی کی طرف سے ہوتا تو نبی القرآن اسے قرآن ہی میں درج فرماتے لیکن ایسا نہیں ہوا — اور پھر یہ حکم رب بھی عجیب نوعیت کا ہے کہ اللہ سبحانہ اسے اپنے قرآن میں جگہ دینے کے قابل ہی نہ سمجھیں مگر ان کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے حوالے ہی سے اشارے کرتے رہیں؟ پھر راویوں کی غلط بیانیوں کے بلاوصف گفتگو کے سیاق سے کہیں بھی یہ معلوم نہیں

ہوتا کہ غیر ملکی سفیروں نے بھی جوابی طور پر کوئی اس قسم کا سوال کیا تھا؟ جس کے جواب میں آپ نے سامی عادت کو حکم رب سے تعبیر کر کے انھیں خاموش کر دیا تھا؟ جب اس نوعیت کی تفاصیل سے یہ واقعہ خاموش ہے تو آخر راویوں پر کیا افتاد پڑ گئی تھی کہ رسول اعظم ﷺ کو بدنام کرنے کے حربوں پر اتر آئے؟

47- ہمیں **محدثین** کی یہ روش عجیب سی لگتی ہے کہ دنیا بھر کی غیر معقول، ضعیف اور وضعی احادیث کو "حدیث قدسی" کا نام دے کر جس طرح چاہیں اخلاقیات کی ساکھ مجروح کرتے چلے جائیں؟ ہم اگر کسی بات کی نبی الاسلام کی طرف نسبت کر دیں تو ثبوت فراہم نہ کرنے کی صورت میں **کذب علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم** کے جرم میں جہنم چلے جائیں۔ اگر ایسی ہی کسی بے سروپا لاف کو **نبی صلی اللہ علیہ وسلم** کی زبانی خدا کی طرف منسوب کر دیں تو سیدھے جنت میں پہنچ جائیں؟ بخدا یہ دین نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک کھلا مذاق ہے جو دین کے نام پر راویان احادیث نے روا رکھا ہے اس طرح تو ہر بو الہوس اپنی ہوس کاری پر تقدس کی چھاپ لگا کر متوازی دین پیش کر سکتا ہے۔۔ پھر کسی کے عقیدے اور عمل پر اعتراض کیوں کر ہو سکتا ہے؟ پھر خواہ مودودی ہوں یا کوئی اور مزاج شناس رسول یا مزاج شناس یزداں وہ اگر اپنی ہوس کاریوں پر تقدس کا لیبل چسپاں کر لیتے ہیں تو ان پر بھی معترض نہ ہونا چاہیے کہ وہ بھی اپنی بات کو نسبت کی عظمت سے منوانے کا طریقہ اختیار کر چکے ہیں۔

غرض مدعا یہ ہے کہ سچائی اپنے وجود کا خود ہی احساس دلاتی ہے۔ اسے غلط اور مصنوعی ذرائع تشہیر سے منوایا نہیں جا سکتا۔ محدثین علم نبوت کے بار اٹھانے کے دعوے دار ہیں انھیں چاہیے کہ امت کی رہنمائی میں علم الانسان، نفسیات اور دیگر اصول بشری کے تقاضوں کا پورا پورا خیال رکھیں وہ عمل بالحدیث کی دھن میں ایسے افکار و آراء کا سہارا لینے سے گریز کریں جو عظمت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے منافی اور سیرت و کردار کے معیار سے ناقابل عمل و ناقابل تسلیم ہوں!

والسلام مع الکرام

هذا كتابنا ينطق عليكم بالحق
ہماری یہ کتاب تمہیں سچ سچ بتا دے گی۔ (جاثیہ ۲۸)
تفسیر
برہان القرآن
یعنی
اس حقیقت کے اظہار میں کہ قرآن کریم کی آیات میں کوئی
تضاد یا تناقض نہیں ہے۔ بعض مزعومہ دلائل و تصورات
کی انقلاب آفریں تحقیق۔
جس میں عربی زبان و ادب کے قدیم و جدید علما
اور محققین اور ماہرین لغت عربی کی تحقیق و
تدقیق کے تناظر میں قرآن کریم کے ان سیکڑوں
واضح اور متعین فیصلوں کے تفصیلی تجزیے ہیں
جنہیں بعض فقہا اور محدثین نے اپنے خود ساختہ
عقائد یا تصورات کے خلاف پا کر کالعدم قرار
دیا تھا ——— قرآن کریم کے محکم
ہونے اور تضاد و تناقض نیز شائبہ نسخ سے
یکسر پاک ہونے کے مسئلے میں برہان قاطع
مطالب قرآن کی تفہیم اور احکام قرآن کی
جوہری تشخیص میں انسانی جہد و تحقیق کا
لازوال شاہکار۔
تحریر
رحمت اللہ طارق
ادارہ • ادبیات اسلامیہ • ملتان
1339/3 - GULSHAN ABAD, O/s PAK GATE, MULTAN.
قیمت 550 — ملنے کا پتہ
1- احمد کابران نمبر 1339/3 گلشن آباد، بیرونی پاک گیٹ، ملتان
2- بزم طلوع اسلام ملتان معرفت شاہ سنز پاک گیٹ ملتان
3- ڈاکٹر محمد سعید چودھری، لاہور۔
فون: 6854528-6924077